دارالعلوم دیوبند کا ترجمان

ماہنامہ

دارالعلوم

جلد: ۱۱۰ | محرم الحرام- صفر المظفر ۱۴۴۸ھ مطابق جولائی ۲۰۲۶ء | شمارہ: ۷

نگراں

حضرت مولانا مفتی ابوالقاسم صاحب نعمانی
مہتمم دارالعلوم دیوبند

مدیر

مولانا محمد سلمان صاحب بجنوری
استاذ دارالعلوم دیوبند

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند- ۲۴۷۵۵۴ یوپی

Tel. : 01336-222429 Fax : 01336-222768
Web : http://www.darululoom-deoband.com
https://darululoom-deoband.com/urdumagazine
E-mail: info@darululoom-deoband.com

DARUL ULOOM Monthly (Urdu)
R. N. I. No.**:** 2133/57
Vol. No. 110, Issue No. 7, July 2026 जुलाई 2026
Published by Maulana Abul-Qasim Numani
Printed by Maulana Abul-Qasim Numani
Editor :- Maulana Mohammad Salman Bijnori
On Behalf of Darul Uloom Grush.
Place of Publication :- Deoband, Saharanpur, U.P.
Printed at: Mukhtar Printing Press Mohalla Bar Ziyaul Haq
Talehari Chungi. Deoband, Saharanpur. U.P.

Rs. 50/= | Annual Subscription Rs. 500/=

Annual by Regd Post. Rs. 700/=

سعودی عرب، افریقہ، برطانیہ، امریکہ، کناڈا وغیرہ سے سالانہ -/۲۱۰۰ روپئے
بنگلہ دیش سے سالانہ -/۸۰۰ روپئے، پاکستان سے ہندوستانی رقم -/۸۰۰ روپئے

فہرست مضامین

حرف آغاز		محمد سلمان بجنوری	۳
قرآنیات	ترجمہ اور تفسیر کا معتدل معیار	ڈاکٹر مفتی اشتیاق احمد قاسمی	۵
فقہی رہنمائی	قرآن بلا وضو چھونا	مولانا عبداللطیف قاسمی	۲۷
فکر ونظر	اجتہاد و تقلید: کچھ ابتدائی باتیں	مفتی محمد طارق محمود	۴۲
نئی کتاب		ڈاکٹر مفتی اشتیاق احمد قاسمی	۵۵

ختم خریداری کی اطلاع

- یہاں پر اگر سرخ نشان ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہوگئی ہے۔
- ہندوستانی خریدار منی آرڈر سے اپنا چندہ دفتر کو روانہ کریں۔
- ایک سال کے لیے اگر بذریعہ رجسٹری طلب فرمائیں تو =/700 روانہ فرمائیں۔
- ہندوستان و پاکستان کے تمام خریداروں کو خریداری نمبر کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

حرف آغاز

محمد سلمان بجنوری

آج کل ملک کے مختلف علاقوں میں مدارس اسلامیہ اور مساجد کے تعلق سے جو صورت حال ہے وہ اہل ایمان کے لیے تو تشویش انگیز ہے ہی، اس سے کوئی دوسرا انصاف پسند آدمی بھی متفق نہیں ہوسکتا، مدارس اسلامیہ کے لیے جو بعض ضابطوں کی معمولی سی خلاف ورزی کا سہارا لے کر بڑی سے بڑی کارروائیاں کی جارہی ہیں، ان سے بہت چھوٹی کارروائیاں، ان سے بہت بڑی خلاف ورزیوں پر بھی دیگر مذاہب کے اداروں کے لیے متوقع نہیں ہیں، بعض صوبوں میں مدارس کے لیے بنے ہوئے سرکاری بورڈ ختم کرکے، تمام اقلیتوں کے لیے ایک مشترکہ بورڈ قائم کیا جارہا ہے اور اس کے دائرے میں ہر قسم کے مدارس کو لاکر مخصوص ضابطوں کا پابند بنایا جارہا ہے۔ یہ بلاشبہ آئین کی ضمانتوں کی خلاف ورزی ہے ان معاملات نے ملک میں مدارس کے لیے صورت حال کو پوری طرح بدل دیا ہے۔

دوسری طرف ذرا ذرا سے بہانوں سے مساجد کے انہدام کا سلسلہ شروع کردیا گیا ہے جس پر بعض جگہ خود برادران وطن نے سوال اٹھایا ہے اور یہ سلسلہ مختلف صوبوں میں جاری ہے؛ بلکہ دراز ہوجاتا جارہا ہے۔

اس کے علاوہ دینی پروگراموں اور تبلیغی جمات کی سرگرمی اور نقل وحرکت کو بھی محدود کرنے کی کوشش جاری ہے۔ پہلے کھلے میدانوں اور عوامی مقامات پر ہونے والے جلسوں ہی کے لیے کچھ ضابطے نافذ کیے جاتے تھے۔ اب مسجد کے اندر ہونے والے پروگراموں کو بھی محدود کرنے کی کوشش ہورہی ہے۔

یہ وہ حالات ہیں جو ہم سب کے سامنے ہیں؛ لیکن ان حالات سے بڑھ کر تشویش ناک بات یہ ہے کہ یہ مشکل حالات بھی ہماری غفلت دور کرنے میں ناکام ہیں، کبھی علامہ اقبال مرحوم نے کہا تھا کہ ''مسلماں کو مسلماں کردیا طوفانِ مغرب نے'' لیکن آج ہمارے دروازے تک پہنچے خطرات کے

باوجود ہم بیدار نہیں ہورہے ہیں، حالات کا تقاضا یہ تھا کہ ہم قانونی کوششوں کے ساتھ اپنی مساجد اور مدارس کے اندرونی نظام کی مکمل اصلاح کے لیے سرگرم ہوجاتے؛ لیکن ایسا لگتا ہے کہ شاید ہم اپنے آپ کو کسی اصلاح کا محتاج ہی نہیں سمجھتے، یہ صحیح ہے کہ ہمارے ساتھ جو کچھ ہورہا ہے وہ اس نظام کا دوہرا معیار ہے؛ لیکن کیا ہم قرآن وحدیث کی اس تعلیم سے بالکل ہی ناواقف ہیں کہ جو مسائل پیش آتے ہیں ان میں ہمارے اپنے اعمال کا بھی دخل ہوتا ہے۔

صورت حال یہ ہے کہ اپنی اور اپنے احوال واعمال کی اصلاح کے بجائے ہم سب اپنی پرانی روش پر قائم ہیں، یہاں تک کہ اپنے ذاتی اختلافات کی بناء پر ملت کو نقصان پہنچانے والے اقدامات سے بھی ایک طبقہ گریز نہیں کررہا ہے؛ بلکہ شاید مزید استعمال ہورہا ہے، جس کے واقعات ہر علاقہ میں سامنے آتے رہتے ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ مدارس اپنے نظام کی خامیوں کو فوری طور پر دور کریں اور صرف نظام کی خامیوں ہی کو نہیں؛ بلکہ اندرون مدارس اور بین المدارس جو ایک دوسرے کے ساتھ ہمارے رویے ہیں ان کو بھی صحیح کریں۔ اسی طرح مساجد کا نظام بھی ہر طرح درست کیا جائے جس میں امام ومؤذن کے ساتھ انتظامیہ کا رویہ بھی شامل ہے۔ اسی طرح تمام دینی طبقات اپنے اپنے طرز عمل پر غور کرکے اصلاح کی فکر کریں اور رجوع الی اللہ کا اہتمام کریں اور یہ جو ''ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا'' رہنے کی روش ہے اسے فوری طور پر ترک کریں۔ اللہ تعالیٰ ہر قسم کے خطرات وآفات سے پوری ملت اور اس کے تمام اداروں کی حفاظت فرمائے۔

* * *

ترجمہ اور تفسیر کا معتدل معیار

(۲/۱)

بقلم: ڈاکٹر مفتی اشتیاق احمد قاسمی
مدرس دارالعلوم دیوبند

اللہ رب العالمین نے اپنی آخری کتاب، پوری انسانیت کی ہدایت کے لیے نازل فرمائی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِلنَّاسِ.

رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اتارا گیا، سارے انسانوں کی رہنمائی کے لیے۔(البقرۃ:185)

قرآنِ کریم کسی خاص طبقے یا مخصوص جماعت کے لیے نہیں؛ بلکہ تمام انسانوں کے لیے سرچشمۂ ہدایت ہے۔ جس طرح یہ گمراہ مسلمانوں کے لیے ہدایت وراہ نمائی کا ذریعہ ہے، اسی طرح مشرکین، منافقین، یہود، نصاریٰ اور ہر فاسق وفاجر انسان کے لیے بھی اس میں ہدایت کے دروازے کھلے ہوئے ہیں؛ اس لیے اگر کوئی یہ کہے کہ قرآن صرف علما، ہی کے سمجھنے اور پڑھنے کی چیز ہے تو یہ بات درست نہیں ہوگی۔

البتہ یہ حقیقت ضرور ہے کہ قرآنِ کریم کے تمام مضامین اور تمام درجاتِ معارف ہر شخص کے فہم میں یکساں طور پر نہیں آ سکتے۔ قرآن سے نصیحت اور عبرت حاصل کرنا ہر انسان کے لیے آسان بنایا گیا ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سورۂ قمر میں بار بار فرمایا:

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ.

اور یقیناً ہم نے نصیحت حاصل کرنے کے لیے قرآن کو آسان بنا دیا ہے، تو ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟ (القمر:22)

علامہ جلال الدین سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ قرآنِ کریم کی بعض آیات ایسی ہیں جن کا عمومی مفہوم عربی زبان جاننے والا ہر شخص سمجھ سکتا ہے، بعض آیات ایسی ہیں جن کے معانی ودقائق صرف اہلِ علم

ہی سمجھ سکتے ہیں، اور بعض آیات کا حقیقی علم اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے۔ (الاتقان فی علوم القرآن، ص:444)

غور کیا جائے تو یہ تقسیم نہایت حکیمانہ معلوم ہوتی ہے۔ اسی حقیقت کو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی مشہور کتاب ''الفوز الکبیر فی اصول التفسیر'' میں مزید وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ آپ کے نزدیک قرآنِ کریم کے مضامین بنیادی طور پر پانچ اقسام پر مشتمل ہیں:

1- آیاتِ احکام　　2- آیاتِ جدل　　3- تذکیرِ نعماءِ الٰہی

4- تذکیرِ ایامِ اللہ یعنی تاریخِ امم سابقہ　　5- تذکیرِ موت و آخرت

قرآنِ کریم کے تمام مضامین انھیں پانچ بنیادی عنوانات کے تحت آ جاتے ہیں۔

ان میں سے اگر تیسری، چوتھی اور پانچویں قسم پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ نصیحت و عبرت پر مشتمل آیات ہیں اوران کا بنیادی پیغام ہر خاص و عام کی سمجھ میں آ سکتا ہے۔

''تذکیرِ نعماءِ الٰہی'' میں اللہ تعالیٰ اپنی بے شمار نعمتوں کا تذکرہ فرما کر بندوں کو اپنی معرفت، قدرت اور ربوبیت کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

''تذکیرِ ایامِ اللہ'' میں انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ السلام اور سابقہ امتوں کے واقعات بیان کیے گئے ہیں؛ تاکہ انسان ان سے عبرت حاصل کرے۔ قرآن بار بار یہ حقیقت واضح کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء اور ان کے ماننے والوں کو بالآخر کامیابی اور غلبہ عطا فرمایا؛ جب کہ حق کی مخالفت کرنے والوں کو رسوائی اور ہلاکت کا سامنا کرنا پڑا۔

اسی طرح ''تذکیرِ موت و آخرت'' کے ذریعے انسان کو یاد دلایا گیا ہے کہ دنیا کی زندگی عارضی ہے، ہر شخص کو ایک دن موت کا مزہ چکھنا ہے اور اس کے بعد ہمیشہ رہنے والی آخرت کی زندگی شروع ہوگی۔ وہاں فرمانبرداروں کے لیے جنت کی نعمتیں اور نافرمانوں کے لیے جہنم کا عذاب تیار ہے۔

یہ تینوں قسم کی آیات ایسی ہیں جن سے ہر مسلمان براہِ راست فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص قرآنِ کریم کو ترجمے کے ساتھ پڑھے تو ان آیات کا بنیادی مفہوم آسانی سے سمجھ سکتا ہے اور ان سے نصیحت حاصل کر سکتا ہے۔

اسی لیے ان آیات کے پیغام کو عام لوگوں تک پہنچانے کی ذمہ داری علماء، واعظین اور مقررین کے کندھوں پر بھی ڈالی گئی ہے۔ ان کا فریضہ ہے کہ وہ منبر و محراب کے ذریعے لوگوں کو قرآن کا پیغام سنائیں، سابقہ امتوں کے واقعات یاد دلائیں، اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کے ذریعے ایمان و معرفت کا

شعور پیدا کریں اور موت وآخرت کی یاد تازہ کرتے رہیں۔(الفوزالکبیر)

اب باقی رہتی ہیں دوقسم کی آیات، یعنی آیاتِ احکام اور آیاتِ جدل۔

''آیاتِ جدل'' سے مراد وہ آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے مختلف گمراہ فرقوں اور باطل عقائد رکھنے والوں کو عقلی اور نقلی دلائل کے ذریعے حق کی دعوت دی ہے اور ان کی غلطیوں کی نشاندہی فرمائی ہے۔قرآنِ کریم نے بالخصوص چار گروہوں کو مخاطب کیا ہے:

-منافقین -مشرکین -یہود -نصاریٰ

منافقین کو خطاب کرتے ہوئے قرآن نے انہیں دورُخی اور نفاق چھوڑ کر خالص ایمان اختیار کرنے کی دعوت دی ہے۔

دورنگی چھوڑ دے یک رنگ ہوجا سراسر موم یا تو سنگ ہو جا

اور انھیں بتایا ہے کہ حقیقی کامیابی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مکمل اطاعت میں ہے۔

مشرکین کو شرک سے منع کیا گیا اور واضح کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں۔فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دینا یا کسی اور کو اس کی الوہیت میں شریک سمجھنا سراسر باطل عقیدہ ہے۔

نصاریٰ کو سمجھایا گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے نہیں؛ بلکہ اللہ کے برگزیدہ رسول ہیں۔اسی طرح یہود کی اس غلط فہمی کی بھی تردید کی گئی کہ حضرت عزیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔

قرآنِ کریم کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔وہ اپنی ذات، صفات اور اختیارات میں یکتا اور بے مثال ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ آیات بنیادی طور پر غیر مسلم اقوام کی اصلاح اور ہدایت کے لیے نازل ہوئی ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو براہِ راست مخاطب فرمایا ہے تو ان کے لیے ان آیات کے بنیادی مفاہیم کو سمجھنا بھی ممکن ہے۔اگر وہ عربی زبان جانتے ہوں تو براہِ راست قرآن سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اور اگر عربی نہیں جانتے تو اپنی زبان میں قرآنِ کریم کا معتبر ترجمہ پڑھ کر اس کے دعوتی پیغام کو سمجھ سکتے ہیں۔

قرآنِ مجید سب کے لیے

مذکورہ تفصیل سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ قرآنِ مجید صرف مسلمانوں کے لیے نہیں؛ بلکہ پوری انسانیت کے لیے کتابِ ہدایت ہے۔جس طرح مسلمانوں کو اس سے رہنمائی حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اسی طرح غیر مسلموں کو بھی قرآن کے پیغام پر غور کرنے اور اسے سمجھنے کی

دعوت دی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک کوئی شخص قرآنِ کریم کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرے گا، وہ اس کی ہدایت اور دعوت سے صحیح طور پر فائدہ نہیں اٹھا سکے گا۔

جب غیر مسلموں کے لیے بھی قرآنِ کریم کو سمجھ کر پڑھنا ضروری ہے تو مسلمانوں کے بارے میں یہ کیسے درست ہوسکتا ہے کہ وہ محض الفاظ کی تلاوت پر اکتفا کریں اور اس کے معانی ومطالب کو سمجھنے کی کوشش نہ کریں؟ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کو بدرجہ اولیٰ قرآنِ کریم کو سمجھ کر پڑھنا چاہیے؛ تاکہ وہ براہِ راست اپنے رب کے پیغام سے وابستہ ہوسکیں اور اس کی ہدایت سے اپنی زندگیوں کو منور کریں۔

قرآنِ کریم میں مناظرہ، مجادلہ اور ردِ باطل سے متعلق جو آیات ہیں، ان کی تشریح وتوضیح کی ذمہ داری علماءِ کلام اور متکلمینِ اسلام کے سپرد کی گئی ہے۔ ان کا فریضہ ہے کہ وہ قرآنِ مجید کی روشنی میں گمراہ عقائد اور باطل نظریات کی کمزوریوں کو واضح کریں، حق کے دلائل پیش کریں اور لوگوں کے شبہات دور کریں؛ تاکہ وہ اطمینانِ قلب کے ساتھ اسلام کی حقانیت کو قبول کرسکیں۔

اب قرآنِ کریم کی پانچویں قسم، یعنی ''آیاتِ احکام'' کی طرف آیئے! ''احکام سے متعلق آیات'' میں بھی ایک درجہ بندی پائی جاتی ہے۔ بہت سے احکام ایسے ہیں جن کا بنیادی مفہوم ہر شخص سمجھ سکتا ہے، خواہ وہ عالم ہو یا عام مسلمان۔ نماز، روزہ، زکوۃ، عدل، احسان اور دیگر بنیادی احکام قرآنِ کریم کے نہایت واضح اور آسان اسلوب میں بیان ہوئے ہیں۔

البتہ بعض احکام ایسے ہیں جن کی تفصیلات اور باریکیاں اہلِ علم ہی سمجھ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر میراث اور تقسیم ترکہ سے متعلق آیات کو لیجیے۔ ان میں بیان کردہ اصولوں کا صحیح اطلاق اور مختلف صورتوں میں ان کی تفصیلی تطبیق ایک دقیق علمی فن ہے، جسے فقہائے کرام اور ماہرینِ فرائض ہی پوری طرح سمجھ سکتے ہیں؛ اسی لیے میراث کے علم کو فقہ کے مشکل ترین ابواب میں شمار کیا جاتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آیاتِ احکام کی تشریح وتوضیح کی ذمہ داری فقہائے کرام کے سپرد کی گئی ہے؛ کیونکہ ہر شخص کے لیے احکامِ شریعت کی تمام جزئیات اور دقائق کو سمجھنا آسان نہیں۔

اسی طرح قرآنِ کریم میں بعض آیات متشابہات کے قبیل سے ہیں، جن کے حقیقی مفہوم تک رسائی انسانی عقل کے لیے ممکن نہیں۔ ان میں حروفِ مقطعات خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ قرآنِ کریم کی متعدد سورتوں کے آغاز میں آنے والے یہ حروف، جیسے: الم، الر، حم، طٰہٰ، یٰس وغیرہ، صدیوں سے علماء اور مفسرین کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔

اگرچہ مفسرین نے ان کے بارے میں مختلف اقوال نقل کیے ہیں؛ لیکن جمہور محققین اور علامہ جلال الدین سیوطیؒ سمیت بہت سے اکابر مفسرین کی رائے یہی ہے کہ ان حروف کا حقیقی مفہوم اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں اور ان کی قطعی مراد کا علم بندوں کو حاصل نہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ علامہ سیوطیؒ کی بیان کردہ تقسیم بالکل درست معلوم ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم کی بہت سی آیات؛ بلکہ اکثر آیات ایسی ہیں جن کا بنیادی مفہوم ترجمے کے ذریعے سمجھا جاسکتا ہے؛ جب کہ بعض آیات ایسی ہیں جن کی صحیح تفہیم کے لیے علمی مہارت اور تخصص ضروری ہے اور بعض متشابہات ایسی ہیں جن کا حقیقی علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

ترجمۂ قرآن کے مطالعے کی ضرورت

اب ذرا اس بات پر غور کیجیے کہ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ عوام کو قرآنِ کریم کا ترجمہ نہیں پڑھنا چاہیے! کیا یہ بات درست ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ اس قول کو مطلقاً درست قرار نہیں دیا جاسکتا۔ زیادہ سے زیادہ اس کا صحیح مفہوم یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص محض ترجمہ پڑھ کر، اہلِ علم سے رجوع کیے بغیر، قرآنِ کریم کی آیات سے اپنی طرف سے نئے معانی اور عقائد اخذ کرنے لگے تو یہ طریقہ درست نہیں؛ کیونکہ قرآنِ کریم کی تفسیر اپنی رائے اور خواہش کے مطابق کرنا شرعاً ممنوع ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

مَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَأَصَابَ فَقَدْ أَخْطَأَ.

جس شخص نے قرآن کے بارے میں اپنی رائے سے بات کی اور اتفاقاً درست بات تک پہنچ گیا، تب بھی اس نے غلط طریقہ اختیار کیا۔ (جامع الترمذی:2952)

ایک دوسری روایت میں ارشاد فرمایا:

وَمَنْ قَالَ فِي الْقُرْآنِ بِرَأْيِهِ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ.

جس شخص نے قرآن کے بارے میں اپنی رائے سے بات کی، وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں تلاش کرلے۔ (جامع الترمذی:2951)

لہٰذا قرآنِ کریم کی تفسیر میں اپنی رائے داخل کرنا قطعاً جائز نہیں؛ لیکن اس حقیقت سے یہ نتیجہ نکالنا بھی درست نہیں کہ مسلمان قرآنِ کریم کو سمجھنے کی کوشش ہی نہ کریں یا ترجمۂ قرآن کا مطالعہ ترک کردیں۔

یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآنِ کریم کی محض تلاوت پر بھی بے شمار ثواب عطا

فرماتے ہیں۔ احادیثِ مبارکہ میں اس کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ وہ اپنے کلام کی تلاوت، اس کے احترام، اس کے بوسہ لینے اور ادب کے ساتھ اس کی طرف دیکھنے پر بھی اجر وثواب عطا فرماتے ہیں؛ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ انسان پوری زندگی قرآنِ کریم کو بغیر سمجھے ہی پڑھتا رہے۔

ذرا غور کیجیے! اگر ہمارے کسی عزیز کا خط ہمیں موصول ہو اور ہم اس کی زبان نہ جانتے ہوں تو کسی جاننے والے کے پاس جاتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ اس میں کیا لکھا ہے؟ اگر موبائل پر کوئی اہم پیغام آجائے اور ہمیں اس کی زبان سمجھ میں نہ آئے تو ہم دوسروں سے اس کا مفہوم معلوم کرتے ہیں؛ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ اللہ رب العالمین کا پیغام، جو پوری انسانیت کی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے، ہم اس کے معانی سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اسے پڑھتے بھی ہیں تو اکثر بغیر سمجھے۔

مزید افسوس کی بات یہ ہے کہ بعض اوقات اہلِ علم کے حلقوں میں بھی قرآنِ کریم کے مسلسل فہم اور تدبر کا وہ اہتمام نہیں پایا جاتا جس کا وہ حقدار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت استاذ محترم شیخ الحدیث مفتی سعید احمد پالن پوریؒ فرمایا کرتے تھے:

''قرآنِ کریم ایک مظلوم صحیفہ ہے''۔

واقعہ یہ ہے کہ آج قرآنِ کریم کے ساتھ ہمارے تعلق میں ایک کمزوری پیدا ہوگئی ہے۔ مدارس میں اگرچہ ترجمۂ قرآن اور تفسیر کی تعلیم دی جاتی ہے؛ لیکن پورے قرآنِ کریم کے فہم اور تدبر کا جو وسیع نظام ہونا چاہیے، اس میں مزید توجہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

اکابرِ امت نے اردو زبان میں قرآنِ کریم کے تراجم اسی لیے کیے تھے کہ عام مسلمان بھی براہِ راست قرآنِ کریم کے پیغام سے وابستہ ہوسکیں۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے بھی امت کے زوال کے اسباب پر غور کرتے ہوئے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی کہ قرآن سے دوری اور باہمی اختلاف امت کی کمزوری کے بڑے اسباب ہیں؛ چنانچہ انھوں نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ قرآنِ کریم کا پیغام گھر گھر پہنچایا جائے؛ تاکہ مسلمانوں کا تعلق دوبارہ کتاب اللہ سے مضبوط ہو۔ (الخیر الکثیر شرح الفوز الکبیر)

ہماری ذمہ داری

آج وقت کا اہم تقاضا یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی طرف دوبارہ بھرپور توجہ دی جائے۔ مدارس میں تعلیمِ قرآن کے نظام کو مزید مؤثر بنایا جائے، عام مسلمانوں کو علماء کی نگرانی اور رہنمائی میں ترجمۂ

قرآن کے مطالعے کی ترغیب دی جائے، مساجد میں قرآن فہمی کے حلقے قائم کیے جائیں اور گھروں میں قرآنِ کریم کے درس کا ماحول بنایا جائے۔

یقیناً امت جتنی زیادہ قرآنِ کریم سے وابستہ ہوگی، اتنی ہی گمراہیوں، فتنوں اور فکری انتشار سے محفوظ رہے گی اور دنیا و آخرت کی کامیابی اس کا مقدر بنے گی۔

ترجمۂ قرآن اور تفسیر میں عوام کی رہنمائی

یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر عوام کو قرآنِ کریم ترجمے کے ساتھ پڑھنے کی ترغیب دی جائے تو اس کا صحیح طریقۂ کار کیا ہوگا؟

اس سلسلے میں عرض ہے کہ عوام الناس کو ایسے تراجم اور تفاسیر کی طرف رہنمائی کی جانی چاہیے جو صحیح العقیدہ، مستند اور اہلِ علم کے ہاں مقبول ہوں۔ عوام کو یہ بتایا جائے کہ وہ اہلِ السنّت والجماعت کے معتبر علماء کے تراجم اور تفاسیر میں سے جس ترجمے یا تفسیر کو چاہیں اختیار کریں؛ لیکن غیر مستند اور گمراہ کن تفاسیر سے اجتناب کریں۔

خصوصاً علمائے دیوبند نے اردو زبان میں قرآنِ کریم کے ترجمے اور تفسیر کے میدان میں عظیم خدمات انجام دی ہیں۔ ان کے متعدد تراجم اور تفاسیر آج بھی اہلِ علم اور عوام دونوں کے لیے قابلِ اعتماد مراجع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ذیل میں چند اہم تراجم و تفاسیر کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے:

(1،2) شاہ رفیع الدین دہلویؒ اور شاہ عبدالقادر دہلویؒ کے تراجم

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے دو صاحبزادگان، حضرت شاہ رفیع الدین دہلویؒ اور حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ، اردو ترجمۂ قرآن (مکمل) کے اولین معماروں میں شمار ہوتے ہیں۔

شاہ رفیع الدینؒ کا ترجمہ لفظی نوعیت کا ہے؛ جب کہ شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ بامحاورہ اور قدرے رواں اسلوب میں ہے۔ اگرچہ آج کے اعتبار سے اس کی زبان قدیم محسوس ہوتی ہے؛ تاہم اپنے زمانے میں یہ اردو ترجمے کا شاہکار تھا۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ شاہ رفیع الدینؒ کا ترجمہ پہلے 1200ھ میں منظرِ عام پر آیا؛ جب کہ شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ اس کے بعد 1205ھ میں شائع ہوا۔

(3) تفسیرِ عزیزی

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ، جو شاہ ولی اللہؒ کے سب سے بڑے صاحبزادے تھے، انھوں نے فارسی زبان میں ''بستان التفاسیر'' کے نام سے ایک عظیم تفسیر لکھی، جو بعد میں ''تفسیرِ

عزیزی'' کے نام سے مشہور ہوئی۔

اس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے اور یہ چار جلدوں میں دستیاب ہے۔ اگرچہ یہ تفسیر مکمل نہیں ہوسکی؛ تاہم انتیسویں اور تیسویں پارے کی تفسیر مکمل ہے اور سورۂ بقرہ کی ابتدائی چوراسی آیات کی تفسیر بھی اس میں شامل ہے۔

اگر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کو اس تفسیر کی تکمیل کا موقع مل جاتا تو یقیناً یہ امت کے لیے ایک عظیم علمی سرمایہ ثابت ہوتی؛ تاہم جو حصہ دستیاب ہے، وہ بھی نہایت قیمتی اور لائقِ استفادہ ہے۔

(4) ترجمۂ شیخ الہندؒ

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمے میں متعدد اصلاحات اور مناسب تبدیلیاں کیں؛ تاکہ اسے اپنے دور کے لوگوں کے لیے زیادہ آسان اور قابلِ فہم بنایا جاسکے۔

(5) مولانا فتح محمد جالندھریؒ کا ترجمہ

اردو زبان میں سب سے زیادہ مقبول اور عام فہم تراجم میں مولانا فتح محمد جالندھریؒ کا ترجمہ نمایاں مقام رکھتا ہے۔ اس کی زبان سادہ، رواں اور دلنشین ہے۔

(6) مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ترجمہ

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ترجمہ اپنے علمی وقار، دقتِ نظر اور احتیاطِ علمی کی وجہ سے اہلِ علم میں خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان میں مذکورہ بالا تراجم کو ''اُمُّ التراجم'' کہا جاسکتا ہے؛ کیونکہ بعد کے اکثر مترجمین نے براہِ راست یا بالواسطہ انھیں تراجم سے استفادہ کیا ہے۔

(7) شیخ احمد لاہوریؒ کا ترجمہ

یہ ترجمہ اپنی سادگی، روانی اور عام فہم اسلوب کے اعتبار سے نہایت عمدہ اور مفید ہے۔

(8) شیخ عبدالحق حقانیؒ کا ترجمہ

شیخ عبدالحق حقانیؒ کا ترجمہ بھی مستند اور قابلِ اعتماد تراجم میں شمار ہوتا ہے۔ شاہ عبدالقادر کا ترجمہ انھوں نے اپنے پیشِ نظر رکھا ہے۔

(9) مولانا سرفراز خان صفدرؒ کا ترجمہ

مولانا سرفراز خان صفدرؒ کا ترجمہ لفظی انداز میں کیا گیا ہے۔ واضح رہے کہ اردو زبان میں لفظی تراجم کی نمایاں مثالیں بنیادی طور پر دو ہیں:

-شاہ رفیع الدین دہلویؒ کا ترجمہ -مولانا سرفراز خان صفدرؒ کا ترجمہ

جب کہ باقی اکثر تراجم بامحاورہ اور تفہیمی نوعیت کے ہیں۔

(10) مولانا صوفی عبدالحمید سواتیؒ کا ترجمہ

مولانا سرفراز خان صفدرؒ کے بھائی مولانا صوفی عبدالحمید سواتیؒ نے بھی نہایت عمدہ اور مفید ترجمہ پیش کیا ہے۔

(11) مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا ترجمہ

مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کا ترجمہ بڑی حد تک حضرت تھانویؒ کے ترجمے سے مستفاد ہے۔ خود مولانا دریابادیؒ نے اپنی ''آپ بیتی'' میں وضاحت کی ہے کہ انھوں نے حضرت تھانویؒ کے ترجمے کو سامنے رکھتے ہوئے تیس فیصد اصلاحات اور تبدیلیاں کی ہیں۔

یہاں ایک دلچسپ علمی پہلو بھی قابلِ ذکر ہے کہ مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اور حضرت تھانویؒ کے درمیان ترجمۂ قرآن کے بعض مقامات کے متعلق خط وکتابت ہوئی۔ ان خطوط میں متعدد مقامات پر حضرت تھانویؒ نے مولانا دریابادیؒ کی آرا، کو قبول فرمایا اور بعض اصلاحات سے اتفاق بھی کیا؛ مگر ان اصلاحات کے ساتھ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ترجمہ میرے علم کے مطابق شائع نہ ہوسکا۔

یہ مکاتیب ''مکتوباتِ حکیم الامت'' میں موجود ہیں اور علمی اعتبار سے نہایت اہمیت رکھتے ہیں۔

(12) مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ کا ترجمہ

یہ ترجمہ بھی اہلِ علم میں معروف اور قابلِ استفادہ سمجھا جاتا ہے۔

(13) مولانا عاشق الٰہی بلندشہریؒ کا ترجمہ وتفسیر

مولانا عاشق الٰہی بلندشہریؒ کی تفسیر اکابرِ دیوبند کی تفسیری خدمات کا عمدہ خلاصہ ہے۔ یہ جامع، آسان اور عام فہم تفسیر ہے۔ اس کا مطالعہ قاری کے لیے متعدد تفاسیر کے فوائد ایک ہی جگہ فراہم کردیتا ہے۔

(14) مولانا احمد سعید دہلویؒ کا ترجمہ

اس ترجمے کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ مترجم نے متعدد اکابر کے تراجم کو سامنے رکھ کر ان کے بہترین اسالیب اور مترادفات کو یکجا کردیا ہے۔ اس میں شاہ رفیع الدینؒ، شاہ عبدالقادرؒ اور حضرت تھانویؒ کے تراجم کا واضح اثر محسوس ہوتا ہے۔

(15) مولانا عبدالقیوم مہاجر مدنیؒ کا ترجمہ

یہ ترجمہ بھی مستند اور قابلِ استفادہ تراجم میں شمار کیا جاتا ہے۔

(16) مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ کا ترجمہ

عصرِ حاضر میں سب سے زیادہ مقبول اور علمی تراجم میں مفتی محمد تقی عثمانی کا ترجمہ نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔اس کی زبان سادہ، شستہ اور موجودہ دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔

(17) مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ کا ترجمہ

یہ ترجمہ بھی علمی حلقوں میں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور عصرِ حاضر کے اہم تراجم میں شامل ہے۔

(18) مولانا اکرم اعوانؒ کا ترجمہ

مولانا اکرم اعوانؒ نے بھی قرآنِ کریم کا عمدہ اور قابلِ مطالعہ ترجمہ پیش کیا ہے۔ان کے ترجمے پر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمے کا اچھا خاصا اثر ہے۔

(19) مفتی سعید احمد پالن پوریؒ کا ترجمہ

استادِ محترم حضرت مفتی سعید احمد پالن پوریؒ کا ترجمہ بھی معاصر اردو تراجم میں ایک اہم اضافہ ہے۔یہ ترجمہ شیخ عبدالقادر دہلوی، حضرت شیخ الہندؒ اور حضرت تھانویؒ کے ترجمے کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے۔اس میں علمی گہرائی اور سہل اسلوب دونوں کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔

یہ وہ نمایاں تراجم ہیں جن کی طرف عوام الناس کی رہنمائی کی جاسکتی ہے۔ان تراجم کا مطالعہ اگر اہلِ علم کی سرپرستی اور رہنمائی میں کیا جائے تو قرآنِ کریم کے پیغام کو سمجھنے اور اس سے وابستگی پیدا کرنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔

سب سے آسان ترجمۂ قرآن مجید حافظی

راقمِ حروف پر اللہ رب العالمین کا یہ خصوصی فضل و احسان ہے کہ اس نے مجھے بھی قرآنِ کریم کا ترجمہ کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔اس ترجمے کی ابتدا ایک دلچسپ پس منظر رکھتی ہے۔

حضرت استادِ محترم شیخ الحدیث مفتی سعید احمد پالن پوری رحمہ اللہ سے مختلف حضرات بار بار درخواست کیا کرتے تھے کہ وہ قرآنِ کریم کا ایک آسان اور عام فہم اردو ترجمہ تیار فرمائیں۔یہ بات ناچیز کے علم میں تھی، اس لیے میں بھی موقع بہ موقع حضرت کی خدمت میں اس جانب توجہ دلاتا رہتا تھا۔

ایک بار جب میں نے حضرت مفتی صاحب کو خلوت میں پا کر گزارش کی کہ ''ترجمۂ قرآن'' کر دیجیے! یہ بہت بڑا کام ہے، اس سے امت کو بہت فائدہ ہوگا، تو حضرت مفتی صاحب نے فرمایا: کیا سارا کام میں ہی کروں؟ تو نہیں کر سکتا؟ تو میں نے تعجب سے پوچھا کہ کیا میں کر سکتا ہوں؟

حضرت نے فرمایا: ہاں کر سکتے ہو! حضرت نے اس امید پر بات کہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ناچیز کو چھ سال جلالین شریف پڑھانے کی توفیق نصیب فرمائی اور تقریباً 10، 12 سال ترجمۂ قرآن پاک کی تدریس کی توفیق نصیب فرمائی اور زبان و بیان کے معیار کو سمجھنے اور برتنے کے لیے اردو زبان و ادب میں ایم، اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کرائی؛ چنانچہ میں نے تھوڑا سا ترجمہ اور اس کی مختصر سی تشریح لکھی اور خدمت میں پیش کی تو حضرت نے اسے پسند فرمایا اور فرمایا: اسی نہج پر چل پڑو! کمی بیشی کی اصلاح بعد میں ہو جائے گی۔

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ کی خواہش تھی کہ ایسا ترجمہ تیار ہو جس میں فارسی اور عربی کے متروک یا مشکل الفاظ سے حتی الامکان اجتناب کیا جائے، علاقائی اور محدود الاستعمال محاورات استعمال نہ ہوں، اور زبان ایسی ہو جسے اردو جاننے والا عام آدمی آسانی سے سمجھ سکے۔

الحمد للہ! انھیں خطوط پر چلتے ہوئے ناچیز نے اپنے اکابر اہل السنّت والجماعت کے انیس معروف تراجمِ قرآن کو سامنے رکھ کر ایک نئے ترجمے کی تیاری کی کوشش کی۔

میرا طریقۂ کار یہ تھا کہ قرآنِ کریم کے ہر لفظ کے لیے اکابر مترجمین کے استعمال کردہ متبادل الفاظ کو ایک جگہ جمع کرتا۔ عموماً ایک لفظ کے چار یا پانچ مختلف ترجمے سامنے آتے۔ ان میں سے سب سے زیادہ آسان، عام فہم اور جامع لفظ کے انتخاب کی کوشش کرتا، پھر عربی تفاسیر اور لغات کی طرف رجوع کر کے اطمینان حاصل کرتا کہ آیا یہ لفظ واقعی قرآنِ کریم کے اصل مفہوم کو ادا کر رہا ہے یا نہیں۔

اسی کے ساتھ لغات القرآن اور عربی زبان کی معتبر لغات سے بھی مدد لیتا۔ جب آیت کے تمام الفاظ کے متبادل منتخب ہو جاتے تو انھیں زندہ اور رواں دواں اردو محاورے میں ترتیب دیتا۔ اس مرحلے میں نحوی اور صرفی نزاکتوں کا بھی خصوصی لحاظ رکھا جاتا۔

اس کے بعد بار بار ترجمے کا مطالعہ کرتا؛ تاکہ یہ دیکھا جا سکے کہ کہیں عبارت میں روانی کی کمی تو نہیں، یا کوئی لفظ قاری کے لیے اجنبی تو محسوس نہیں ہوتا۔ میری کوشش یہ رہی کہ جب کوئی شخص قرآنِ کریم کی تلاوت کے ساتھ ترجمہ پڑھے تو قرآن کا مضمون اس کے ذہن میں پوری طرح نقش ہو جائے۔

بعض مقامات پر جب مجھے کسی لفظ یا محاورے کے بارے میں تردد ہوتا کہ آیا ایک عام آدمی اسے سمجھ سکے گا یا نہیں، تو میں گھر کے بچوں کے سامنے وہ عبارت پڑھ کر ان سے دریافت کرتا۔ کبھی اہلیہ سے دریافت کرتا اور کبھی کسی عام پڑھے لکھے شخص کے سامنے بول کر اندازہ کرتا۔

خصوصاً کورونا لاک ڈاؤن کے زمانے میں اس سلسلے میں متعدد لوگوں سے استفادہ کا موقع ملا۔

علاقائی الفاظ اور محاورات کے بارے میں مختلف علاقوں کے لوگوں سے پوچھتا؛ تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ کون سا لفظ مخصوص خطے تک محدود ہے اور کون سا ایسا ہے جسے پورے برصغیر کا اردو داں طبقہ آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

مقصد صرف یہ تھا کہ قرآنِ کریم کا پیغام زیادہ سے زیادہ لوگوں تک سہل اور مؤثر انداز میں پہنچ سکے۔

الحمدللہ، اس کام میں خاصی محنت صرف کی گئی۔ ابتدائی مسودہ مکمل ہونے کے بعد متعدد فضلاء اور اہلِ علم کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ بعض حضرات نے مکمل ترجمہ دیکھا اور بعض نے مختلف پاروں اور منتخب مقامات کا جائزہ لیا؛ تاکہ اس کی صحت اور افادیت کے بارے میں مزید اطمینان حاصل ہوسکے۔

جب مختلف اہلِ علم کے مشوروں کے بعد کافی حد تک اطمینان ہوگیا تو اس کی کتابت کرائی گئی اور تصحیح کے مرحلے میں بھی غیر معمولی محنت کی گئی۔

اس کے بعد ناچیز نے مکمل مسودہ حضرت استادِ محترم مفتی محمد امین پالن پوری مدظلہ العالی کی خدمت میں پیش کیا اور عرض کیا:

اگر حضرت مفتی سعید احمد پالن پوری رحمہ اللہ حیات ہوتے تو اس ترجمے کی نوک پلک سنوار دیتے اور اسے مزید بہتر بنا دیتے۔ اب حضرت موجود نہیں ہیں، اس لیے آپ ہی اس پر نظرِ کرم فرمائیں۔ اگر یہ اشاعت کے قابل ہو تو شائع کیا جائے، ورنہ اسے الماری کی زینت بنائے رکھنا ہی مناسب ہوگا؛ کیونکہ قرآنِ کریم کا معاملہ نہایت نازک اور ذمہ داری کا متقاضی ہے۔

حضرت نے فرمایا:

بخاری شریف کی تکمیل کے بعد میں اطمینان سے اس ترجمے کا مطالعہ کروں گا؛ چنانچہ ترجمہ ان کی خدمت میں پہنچا دیا گیا۔ حضرت نے کئی ہفتوں تک پوری توجہ کے ساتھ اس کا مطالعہ فرمایا۔ بعد ازاں مجھے طلب فرمایا، بعض مقامات پر اصلاحی مشورے دیے اور پھر ارشاد فرمایا:

’’ترجمہ اچھا ہے، اسے شائع ہونا چاہیے۔ ماشاء اللہ تم نے اس پر بڑی محنت کی ہے۔ میں نے متعدد مقامات پر اس کے الفاظ بدلنے کی کوشش کی؛ لیکن اکثر جگہ مجھے تمہارے منتخب کردہ الفاظ سے زیادہ آسان اور مناسب لفظ نہیں ملا۔ کبھی فارسی لفظ سامنے آتا، کبھی عربی، اور کبھی ایسا لفظ جو عام فہم نہ تھا؛ اس لیے مجھے امید ہے کہ یہ ترجمہ عوام کے لیے مفید ثابت ہوگا۔‘‘

بعد ازاں حضرت نے چند جامع اور قیمتی جملوں میں اس ترجمے کی تائید و توثیق بھی تحریر فرمائی، جس کے بعد اسے زیورِ طباعت سے آراستہ کیا گیا۔

سب سے آسان ترجمۂ قرآن کی خصوصیات

ناچیز کی بنیادی کوشش یہ رہی کہ قرآنِ کریم کا ایسا ترجمہ پیش کیا جائے جسے وہ شخص بھی سمجھ سکے جو صرف عام اخبارات یا روزمرہ اردو کا مطالعہ کرتا ہے۔

اس مقصد کے لیے عربی تفاسیر، لغاتِ عرب، لغات القرآن اور اردو زبان کی متعدد مستند لغات سے استفادہ کیا گیا۔ اردو محاورے کے انتخاب میں بھی خاص احتیاط برتی گئی اور ایسے الفاظ استعمال کرنے کی کوشش کی گئی جو زندہ زبان کی نمائندگی کرتے ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ اس ترجمے میں نہ غیر ضروری فارسی آمیزش ہے، نہ ثقیل عربی تراکیب، اور نہ ہی علاقائی محاورات کی بھرمار۔ مقصد صرف یہ ہے کہ قاری براہِ راست اللہ تعالیٰ کے کلام کو سمجھ سکے۔

''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا''؟ اس ترجمے کا مطالعہ کرنے والا خود اس کی آسانی اور سلاست کا اندازہ کرسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے اردو ترجمے کے بعد ہندی زبان اور رومن انگریزی میں بھی قرآنِ کریم کے ترجمہ کی توفیق حاصل ہوئی اور یہ تینوں تراجم شائع ہو چکے ہیں۔ الحمد للہ، قارئین نے انھیں قبول کیا اور ان سے استفادہ کا سلسلہ جاری ہے۔

اس ترجمے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اسے اکابرِ دیوبند کے علمی منہج اور تفسیری اصولوں کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے۔

فارسی تراجمِ قرآن کے بارے میں ایک وضاحت

اگر کوئی شخص فارسی زبان جانتا ہو تو اسے علامہ شریف جرجانی رحمہ اللہ اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کے فارسی تراجمِ قرآن کی طرف رہنمائی کی جاسکتی ہے۔

یہاں ایک علمی نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے۔ عام طور پر یہ بات مشہور ہے کہ فارسی زبان میں قرآنِ کریم کا سب سے پہلا ترجمہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے کیا تھا، لیکن ناچیز کی معلومات کے مطابق یہ بات محلِ نظر ہے۔

اس لیے کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ سے پہلے علامہ سیّد شریف جرجانی رحمہ اللہ کا فارسی ترجمۂ قرآن موجود تھا اور مطبوعہ صورت میں دستیاب بھی رہا ہے۔ غالب گمان یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے پیشِ نظر بھی یہ ترجمہ رہا ہوگا۔

البتہ افسوس ناک امر یہ ہے کہ بعض طباعتوں میں علامہ شریف جرجانی رحمہ اللہ کا نام حذف

کر کے اس کی جگہ شیخ سعدی رحمہ اللہ کا نام درج کر دیا گیا، حالانکہ شیخ سعدی رحمہ اللہ کے نام سے قرآنِ کریم کا کوئی مستقل ترجمہ معروف نہیں۔

حضرت مولانا عبدالحق حقانی رحمہ اللہ نے (البیان ص 491 میں) اس امر کی صراحت کی ہے کہ چھاپنے والوں کی اس کارستانی کو انھوں نے خود دیکھا ہے۔

بلاشبہ یہ علمی دیانت کے خلاف ایک سنگین طرزِ عمل ہے۔ غالباً ایسا کرنے والوں کے پیشِ نظر تجارتی مصلحت رہی ہوگی کہ شیخ سعدی کا نام زیادہ معروف ہے، اس لیے کتاب زیادہ فروخت ہوگی؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسی علمی تصنیف کو اس کے اصل مصنف سے منسوب نہ کرنا ایک بڑی خیانت اور اہلِ علم کے حقوق پر دست درازی ہے، جس سے ہر حال میں اجتناب ضروری ہے۔

ترجمۂ قرآن میں ولی اللہی اصول

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کو برصغیر میں حدیث اور قرآن، دونوں علوم کے احیاء کا امتیاز حاصل ہے۔ جس طرح حدیثِ نبوی ﷺ کی خدمت کے میدان میں آپ کو ''مُسنِدُ الہند'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، اسی طرح قرآنِ کریم کے ترجمے اور تفسیر کے باب میں بھی آپ ایک عظیم رہنما اور سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آپ نے ہندوستان کے نہایت نازک اور دشوار حالات میں فارسی زبان میں قرآنِ کریم کا ترجمہ کیا اور اس کے ساتھ اپنے تینوں صاحبزادگان کو بھی ترجمۂ قرآن اور تفسیرِ قرآن کی طرف متوجہ رکھا۔ شاید تاریخِ عالم میں اس کی دوسری مثال مشکل سے ملے کہ ایک ہی خاندان کے چار افراد نے قرآنِ کریم کے ترجمے اور تفسیر کے میدان میں ایسی غیر معمولی خدمات انجام دی ہوں اس طرح کہ ہر ایک کا انداز، اسلوب اور علمی امتیاز الگ الگ ہو۔

حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمہ اللہ، جو حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے چھوٹے صاحبزادے تھے، ان کا شمار اردو ترجمۂ قرآن کے عظیم ترین معماروں میں ہوتا ہے۔ آپ نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ دہلی کی مشہور مسجد عالمگیری میں تدریس، دعوت اور علمی تصنیف و تالیف میں گزارا۔ آپ نے تقریباً چالیس سال تک قرآنِ کریم کے ترجمے اور تفسیر پر محنت کی۔

آپ کا ترجمہ اپنی سلاست، جامعیت، اختصار اور معنوی گہرائی کے اعتبار سے اردو ادب اور ترجمہ نگاری کا ایک شاہکار ہے؛ جب کہ آپ کی تفسیر ''موضح القرآن'' تفسیری ذخیرے میں منفرد مقام رکھتی ہے۔ بعد کے اکثر مترجمین اور مفسرین نے براہِ راست یا بالواسطہ آپ سے استفادہ کیا ہے

اوراسی لیے انہیں اردو ترجمۂ قرآن کا سب سے مؤثر پیشوا قرار دیا جاسکتا ہے۔

المقدمۃ فی قوانین الترجمہ

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کو قرآنِ کریم سے جو خصوصی مناسبت حاصل تھی، اس کا ایک اہم مظہر یہ ہے کہ آپ نے ترجمۂ قرآن کے اصول وضوابط بھی مرتب فرمائے۔ یہ اصول ایک مختصر مگر نہایت قیمتی رسالے ''المقدمۃ فی قوانین الترجمہ'' میں بیان کیے گئے ہیں۔

ناچیز نے اس رسالے کا مطالعہ کیا اور اس کے اہم نکات کو اختصار کے ساتھ مرتب کیا ہے، جو حسبِ ذیل ہیں:

(1) جامعیتِ مفہوم

ترجمہ ایسا ہونا چاہیے جو حتی الامکان اصل عبارت کی جامعیت اور وسعتِ مفہوم کو برقرار رکھ سکے۔

(2) زبان کے اسلوب کی رعایت

جس زبان میں ترجمہ کیا جارہا ہو، اس کے افعال، تراکیب اور اسلوبِ بیان کا لحاظ رکھا جائے۔

(3) مناسب متبادل کا انتخاب

ہر لفظ کے لیے مناسب متبادل لایا جائے اور اگر مترجم الیہ زبان میں کسی لفظ کا مکمل متبادل موجود نہ ہو تو اصل زبان کے قریب ترین اور مناسب ترین مترادف کو اختیار کیا جائے۔

(4) زبان کا معیار برقرار رکھنا

ترجمے میں زبان کے فطری اور علمی معیار کو برقرار رکھا جائے اور غیر ضروری تصنع سے اجتناب کیا جائے۔

(5) غیر ضروری اضافہ نہ کرنا

اصل عبارت میں جتنے الفاظ ہوں، ترجمے میں بھی حتی الامکان اتنے ہی الفاظ استعمال کیے جائیں اور غیر ضروری اضافوں سے بچا جائے۔

(6) مجبوری میں توضیحی اضافہ

اگر مفہوم کی ادائیگی کے لیے اضافی الفاظ ناگزیر ہوں تو ضرورت کے مطابق ان کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔

(7) تقدیم وتاخیر میں احتیاط

اصل ترتیب کو برقرار رکھنے کی کوشش کی جائے؛ البتہ ضرورت کے وقت تقدیم وتاخیر اختیار

کرنے میں مضائقہ نہیں۔

(8) محذوفات کی وضاحت

جہاں مفہوم کی تکمیل کے لیے محذوفات کو ظاہر کرنا ضروری ہو، وہاں محذوف الفاظ کو واضح کیا جانا چاہیے!

(9) ضمائر کی تعیین

بعض مواقع پر ضمیر کے مرجع کو واضح کرنے کے لیے ضمیر کی صراحت بھی کی جاسکتی ہے۔

(10) عامل کا اعادہ

اگر مفہوم کے استحضار کے لیے ضرورت محسوس ہو تو عطف کی صورت میں عامل کا اعادہ کیا جاسکتا ہے۔

(11) قواعدِ نحو وصرف کی رعایت

ترجمے میں نحوی اور صرفی اصولوں کا مکمل لحاظ رکھا جائے۔

(12) مراد کی وضاحت

اگر ترجمے سے مقصود مفہوم واضح نہ ہوتا ہو تو مناسب توضیح کے ذریعے مراد کو واضح کیا جائے۔

(13) اسلوب اور زورِ کلام کی حفاظت

اصل زبان میں جہاں جس نوعیت کا زور، تاکید، حصر یا بلاغی خصوصیت پائی جاتی ہو، مترجم کو حتی الامکان اسے ترجمے میں منتقل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ اصول ترجمۂ قرآن کے نہایت اہم اور دقیق اصولوں میں سے ہے۔ محض الفاظ منتقل کردینا کافی نہیں؛ بلکہ اصل عبارت کی روح، تاثیر اور اسلوب کو بھی منتقل کرنا ضروری ہے، اور یہ کام غیر معمولی علمی مہارت اور مسلسل محنت کا متقاضی ہے۔

(14) معنیٔ قرآن کی سند

حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمہ اللہ نے اس سلسلے میں ایک نہایت اہم اضافہ بھی فرمایا ہے کہ: معنیٔ قرآن بلاسند معتبر نہیں۔

یعنی قرآنِ کریم کے معانی ومطالب بیان کرنے کے لیے معتبر علمی روایت اور مستند علمی تسلسل کا ہونا ضروری ہے۔

ناچیز نے اس اصول کو اس طرح سمجھا ہے کہ مترجم جب کسی لفظ یا جملے کا مفہوم بیان کرے تو اس کے ذہن میں اس مفہوم کی علمی بنیاد، لغوی تحلیل اور تفسیری حوالہ موجود ہونا چاہیے۔ محض ذاتی رائے یا

قیاس کی بنیاد پر قرآنِ کریم کے معانی متعین نہیں کیے جاسکتے۔

ولی اللّٰہی منہج کی اہمیت

یہ چند اصول ہیں جنھیں اختصار کے ساتھ یہاں نقل کیا گیا ہے۔ممکن ہے کہ ناچیز کی تعبیر میں کوئی کمی یا کوتاہی رہ گئی ہو، اس لیے سنجیدہ اہلِ علم سے گزارش ہے کہ وہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی اصل کتاب یا اس کے اردو ترجمے کا براہِ راست مطالعہ ضرور کریں۔

اس رسالے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اپنے فارسی ترجمۂ قرآن میں کس درجہ احتیاط اور علمی دیانت سے کام لیا ہے۔اسی طرح ان کے صاحبزادگان کے تراجم اور تفاسیر میں بھی انہی اصولوں کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

خصوصاً حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمہ اللہ کے ترجمے کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ اپنے والدِ گرامی کے وضع کردہ اصول، مزاج اور منہج کی کامل ترجمانی کرتے ہیں۔اسی لیے ان کا ترجمہ اردو تراجمِ قرآن میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے، اور بہت سے اہلِ علم کے نزدیک اس کا امتیاز آج تک پوری طرح کسی دوسرے مترجم کو حاصل نہ ہوسکا۔

ناچیز کا تاثر یہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے ترجمے کے یہ اصول گویا اپنے علمی خانوادے اور بالخصوص اپنے صاحبزادگان کی رہنمائی کے لیے مرتب فرمائے تھے؛ چنانچہ ان کے تینوں فرزندوں نے انھی خطوط کو مشعلِ راہ بنایا اور انھی اصولوں کی روشنی میں ترجمۂ قرآن اور تفسیرِ قرآن کی خدمات انجام دیں۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کے بعد اہلِ السنّت والجماعت، بالخصوص علمائے دیوبند کے جتنے معتبر تراجمِ قرآن سامنے آئے ہیں، ان میں کسی نہ کسی درجے میں ولی اللّٰہی اصولوں کی جھلک اور ان کی پابندی نمایاں طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ برصغیر میں ترجمۂ قرآن کی علمی روایت کا ایک بڑا حصہ بالواسطہ یا بلاواسطہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کے قائم کردہ علمی منہج سے وابستہ نظر آتا ہے۔

تراجم وتفاسیر کے انتخاب میں احتیاط

اہلِ علم کی یہ اہم ذمہ داری ہے کہ وہ خود بھی قرآنِ کریم کے معتبر تراجم وتفاسیر سے وابستہ رہیں اور عام مسلمانوں کی بھی صحیح رہنمائی کریں؛ تاکہ وہ ایسے تراجم اور تفاسیر کے مطالعے سے محفوظ رہیں جن میں عقیدے، منہج یا تفسیر کے اصولوں کے اعتبار سے قابلِ اعتراض باتیں پائی جاتی ہوں۔

اس سلسلے میں یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ کسی مترجم یا مفسر کی مجموعی خدمات اپنی جگہ؛ لیکن قرآنِ کریم کے ترجمے اور تفسیر میں اصل معیار یہ ہے کہ وہ اہل السنۃ والجماعۃ کے متوارث علمی منہج اور جمہور امت کی تشریحات کے مطابق ہو۔

مثال کے طور پر بعض تراجم ایسے ہیں....... جیسے مولانا احمد رضا خان بریلوی وغیرہ کا ترجمہ..... جن میں مجموعی طور پر بہت سی خوبیاں موجود ہیں اور ان کے مؤلفین نے اپنے سے پہلے اکابر مترجمین، خصوصاً حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمہ اللہ کے ترجمے سے استفادہ بھی کیا ہے؛ لیکن بعض مقامات پر ایسی تعبیریں اختیار کی گئی ہیں جن پر اہلِ علم نے نقد کیا ہے اور انھیں محلِ نظر قرار دیا ہے۔

اسی طرح بعض معاصر تفاسیر اور تراجم ..... جیسے مولانا مودودی صاحب کا ترجمہ وتفسیر ''تفہیم القرآن''، وغیرہ....... جن کے بارے میں بھی اہلِ علم نے متعدد علمی اعتراضات ذکر کیے ہیں۔ ان اعتراضات میں ترجمے کے اسلوب، بعض تفسیری آراء، اسرائیلیات کی کثرت، نصوص کے فہم، یا بعض تاریخی واعتقادی مباحث سے متعلق امور شامل ہیں۔ ان تفصیلات کا یہ محل نہیں؛ کیونکہ ان پر مستقل کتابیں اور مقالات لکھے جا چکے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ عوام کی رہنمائی قابلِ اعتماد تفسیروں اور ترجموں کی طرف کی جائے اگر کوئی ذرہ برابر بھی مسلکِ حق سے ہٹا ہوا ہے تو اس کے ترجمے اور تفسیر کی طرف رہنمائی ہرگز نہیں کرنی چاہیے؛ بلکہ اس سے بچے رہنے کی تلقین کرنی چاہیے!

اصولی طور پر یہ سمجھنا چاہیے کہ قرآنِ کریم کے مطالعے میں ایسے تراجم اور تفاسیر اختیار کیے جائیں جو:

- جمہور اہل السنۃ والجماعۃ کے منہج کے مطابق ہوں۔
- اکابر مفسرین کے علمی ذخیرے سے مربوط ہوں۔
- شخصی آراء کے بجائے متوارث علمی روایت پر اعتماد کرتے ہوں۔
- نصوصِ شرعیہ کے فہم میں احتیاط اور اعتدال کو ملحوظ رکھتے ہوں۔

لہٰذا عوام الناس کی رہنمائی ہمیشہ معتبر اور قابلِ اعتماد تراجم وتفاسیر کی طرف کی جانی چاہیے؛ تاکہ قرآنِ کریم کا فہم صحیح بنیادوں پر حاصل ہو اور فکری انحرافات سے حفاظت ہو سکے۔

تفسیر کا وسیع مفہوم

تفسیر کے لغوی معنی ہیں: کسی بات کو کھول کر بیان کرنا، واضح کرنا اور اس کی حقیقت کو روشن کرنا۔

اصطلاحی اعتبار سے علمِ تفسیر کا دائرہ زمانے کے ساتھ ساتھ وسیع ہوتا گیا ہے۔ ابتدائی ادوار میں

تفسیر سے عموماً تین بنیادی مقاصد مراد لیے جاتے تھے:

1- قرآنِ کریم کے مضامین کی وضاحت۔

2- آیاتِ احکام سے شرعی احکام کا استخراج۔

3- آیاتِ حکمت سے اسرار ورموز کی دریافت۔

چنانچہ علامہ بدرالدین زرکشی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

هو علمٌ يُعرَفُ به فَهْمُ كتابِ اللهِ المُنَزَّلِ على نبيِّهِ ﷺ، وبيانُ معانيهِ، واستخراجُ أحكامِهِ وحِكَمِهِ.

علمِ تفسیر وہ علم ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی اس کتاب کا فہم حاصل کیا جاتا ہے جو اس کے نبی ﷺ پر نازل ہوئی اور جس کے ذریعے اس کے معانی، احکام اور حکمتیں معلوم کی جاتی ہیں۔ (البرہان فی علوم القرآن 1/13)

بعد کے ادوار میں علمِ تفسیر کا مفہوم مزید وسیع ہوگیا۔ علامہ آلوسی رحمہ اللہ نے اپنی مشہور تفسیر روح المعانی میں علمِ تفسیر کی تعریف یوں کی ہے

هو علمٌ يُبْحَثُ فيه عن كيفيةِ النُّطْقِ بألفاظِ القرآنِ، ومدلولاتِها، وأحكامِها الإفراديةِ والتركيبيةِ، ومعانيها التي تُحمَلُ عليها حالةَ التركيبِ، وتتماتٍ لذلك. (روح المعانی 1/4)

ترجمہ: تفسیر وہ علم ہے جس میں الفاظ قرآن کی ادائیگی کے طریقوں اور ان کے معانی اور ان کے انفرادی اور ترکیبی احکام اور ان معانی سے جن پر الفاظ ترکیب کی حالت میں دلالت کرتے ہیں اور اس (علم) کے تتموں سے بحث کی جاتی ہے۔

اس تعریف پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ علمِ تفسیر کے متعدد اجزاء ہیں:

1- الفاظِ قرآن کی ادائیگی

قرآنِ کریم کے الفاظ کس طرح پڑھے جاتے ہیں، مختلف قراءات کا مفہوم پر کیا اثر پڑتا ہے، اور قراءت کے اختلاف سے معنی میں کیا وسعت پیدا ہوتی ہے؛ یہ سب مباحث علمِ تفسیر کا حصہ ہیں۔ اس اعتبار سے علمِ قراءات تفسیر میں شامل ہے۔

2- الفاظِ قرآن کے لغوی معانی

قرآنِ کریم کے الفاظ کے اصل لغوی مفاہیم، ان کے استعمالات، شواہد اور نظائر کی تحقیق بھی تفسیر کا

اہم شعبہ ہے۔اسی لیے مفسرین ''لغت'' کی کتابوں اوراہلِ لغت کے اقوال سے استدلال کرتے ہیں۔

3-الفاظِ قرآن کے انفرادی احکام

ہرلفظ کا مادہ، وزن، باب، صیغہ، اشتقاق اورصرفی ساخت کیا ہے، یہ تمام مباحث ''علمِ صرف'' سے تعلق رکھتے ہیں؛ چنانچہ علمِ صرف بھی علمِ تفسیر کے بنیادی معاون علوم میں شامل ہے۔

4-الفاظِ قرآن کے ترکیبی احکام

جب الفاظ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر جملہ بنتے ہیں تو ان کے نحوی تعلقات، اعراب، تقدیرات اور ترکیبی معانی کیا ہوتے ہیں، یہ مباحث ''علمِ نحواورعلمِ معانی'' سے متعلق ہیں، اس لحاظ سے نحواور بلاغت کا ایک بڑا حصہ علمِ تفسیر میں داخل ہے۔

5-آیات کے مجموعی اورسیاقی معانی

تفسیر کا سب سے اہم مقصد یہ ہے کہ آیت اپنے سیاق وسباق کے اعتبار سے کیا پیغام دے رہی ہے، اس کے مضامین کیا ہیں اوراس سے کیا احکام، عقائداور ہدایات مستفاد ہوتے ہیں۔اس مرحلے میں علمِ حدیث، ''علمِ اصولِ فقہ اورعلمِ بیان'' سے مدد لی جاتی ہے۔

6-تفسیر کے تکملات

علمِ تفسیر میں صرف الفاظ اورمعانی ہی زیرِ بحث نہیں آتے؛ بلکہ ان کے ساتھ:

-اسبابِ نزول -ناسخ ومنسوخ -تاریخی پس منظر -سیرتِ نبوی ﷺ

-آثارِ صحابہ وتابعین -نصیحت وموعظت -حکمتیں اورلطائف

-تجربات ومشاہدات سے حاصل ہونے والے نکات بھی زیرِ بحث آتے ہیں؛اسی لیے تفسیر کو علومِ اسلامیہ کا جامع ترین فن قرار دیا گیا ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ نے نہایت بجا فرمایا ہے کہ:

علمِ تفسیر کا میدان انتہائی وسیع ہے، اوراس میں دنیا کے تقریباً ہرعلم وفن کی معلومات کسی نہ کسی درجے میں شامل ہوسکتی ہیں۔(علوم القرآن، الخیرالکثیر)

اسی وجہ سے مفسرِ قرآن کے لیے محض زبان دانی کافی نہیں؛ بلکہ اسے متعددعلوم وفنون سے مناسب اوراُن پر دسترس حاصل ہونا ضروری ہے؛ تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے کلام کا مفہوم صحیح انداز میں بیان کرسکے۔

اصولِ تفسیر

اصولِ تفسیر اس علم کا نام ہے جس میں قرآنِ کریم کی تفسیر کے قواعد وضوابط، فہمِ قرآن کے

اصول، اور مفسرینِ کرام کے مناہج و اسالیب سے متعلق بنیادی مباحث بیان کیے جاتے ہیں۔

حضرت مولانا مفتی محمد امین پالن پوری دامت برکاتہم اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اصولِ تفسیر میں قرآن کی تفسیر کے قوانین وضوابط اور مفسرین کی تفسیروں کے بارے میں مفید نکات بیان کیے جاتے ہیں۔'' (الخیرالکثیر، ص:74)

یہاں طالبِ علم کو ایک بنیادی حقیقت اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ فقہائے احناف نے درحقیقت فہمِ قرآن کے اصول کا ایک بڑا حصہ اپنی اصولی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ اگرچہ ان مباحث کو عموماً ''اصولِ فقہ'' کے عنوان سے پڑھا جاتا ہے؛ لیکن ان کا ایک بڑا حصہ حقیقت میں آیاتِ قرآنیہ سے احکام کے استخراج کے اصولوں پر مشتمل ہے۔

فقہائے احناف کے نزدیک شرعی دلائل کے بنیادی مصادر چار ہیں:

1- کتاب اللہ 2- سنتِ رسول ﷺ 3. اجماع 4- قیاس

اصولِ فقہ میں خصوصیت کے ساتھ ''کتاب اللہ'' سے احکام اخذ کرنے کے طریقے بیان کیے گئے ہیں؛ چنانچہ الفاظِ قرآن کے انفرادی اور ترکیبی مفاہیم، دلالاتِ الفاظ اور استنباطِ احکام کے قواعد نہایت تفصیل کے ساتھ ذکر کیے گئے ہیں۔ مثلاً:

(۱) خاص وعام، مشترک ومؤول (۲) ظاہر، نص، مفسر اور محکم

(۳) خفی، مشکل، مجمل اور متشابہ (۴) حقیقت ومجاز

(۵) صریح وکنایہ (۶) مطلق ومقید

(۷) امر ونہی (۸) عبارت النص، اشارۃ النص، دلالۃ النص اور اقتضاء النص

اور اس نوعیت کے دیگر مباحث، سب دراصل کتاب اللہ سے احکام کے استخراج کے اصول ہیں۔ اس اعتبار سے یہ مباحث اصولِ تفسیر ہی کا ایک اہم حصہ شمار ہوتے ہیں، اگرچہ انھیں اصولِ فقہ کے عنوان کے تحت مرتب کیا گیا ہے۔

اصولِ فقہ اور اصولِ تفسیر کا فرق

اگر غور کیا جائے تو اصولِ فقہ کا اصل مقصد آیاتِ احکام سے شرعی احکام کا استخراج ہے، اس لیے اس کا دائرہ بنیادی طور پر احکامِ شرعیہ کے استنباط تک محدود رہتا ہے۔

رہا قرآنِ کریم کا جدلی اور اعتقادی پہلو، تو اس کے اصول علمِ عقیدہ اور علمِ مناظرہ میں بیان کیے گئے ہیں۔ قرآنِ کریم نے مشرکین، یہود، نصاریٰ، منافقین اور دیگر گمراہ فرقوں سے جو استدلالی

گفتگو کی ہے، اس کے فہم کے لیے علمِ عقیدہ اور علمِ مناظرہ کی ضرورت پیش آتی ہے؛ اسی طرح قرآنِ کریم کی تذکیری آیات، یعنی:

- اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا تذکرہ، - موت وآخرت کی یاددہانی،
- شواہدِ قدرت اور دلائلِ توحید، - امم سابقہ کے واقعات،

ان کے اثرات انسانی فطرت پر براہِ راست مرتب ہوتے ہیں۔ عام طور پر ان آیات کو سمجھنے کے لیے کسی پیچیدہ اصولی بحث کی ضرورت نہیں پڑتی۔ قرآن کا قاری جب اخلاص اور تدبر کے ساتھ ان آیات کا مطالعہ کرتا ہے تو ان کے معانی اور نصیحتیں اس کے دل پر خود بخود منکشف ہونے لگتی ہیں۔

وہ کبھی موت کو یاد کرتا ہے، کبھی آخرت کی جواب دہی کو، کبھی انبیائے کرام علیہم السلام کے واقعات سے سبق حاصل کرتا ہے اور کبھی کائنات کے مشاہدے کے ذریعے اپنے خالق کی معرفت حاصل کرتا ہے۔ اسی وجہ سے اصولِ فقہ میں تذکیر کی ان اقسام پر مستقل بحث نہیں کی گئی۔

اصولِ تفسیر کی مستقل ضرورت

اس کے باوجود یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ صرف اصولِ فقہ کا مطالعہ تفسیرِ قرآن کے لیے کافی ہے؛ کیونکہ اصولِ فقہ کا محور آیاتِ احکام اور استنباطِ مسائل ہے، جب کہ علمِ تفسیر کا میدان اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ اسی ضرورت کے پیشِ نظر علمائے امت نے اصولِ تفسیر کے موضوع پر مستقل کتابیں تصنیف فرمائیں، جن میں درج ذیل مباحث کو تفصیل سے بیان کیا گیا:

(۱) اسبابِ نزول (۲) ناسخ ومنسوخ (۳) فہمِ مراد کے اصول
(۴) آیاتِ متشابہات کی تشریح (۵) فرقۂ باطلہ کے شبہات کا ازالہ
(۶) مختلف تفسیری مناہج کا جائزہ (۷) غرائبِ قرآن
(۸) قراءاتِ قرآنیہ (۹) علومِ قرآن کے متفرق مباحث

اس لیے ایک سنجیدہ طالبِ علم کے لیے ضروری ہے کہ:

- آیاتِ احکام کے فہم کے لیے اصولِ فقہ پڑھے۔
- اعتقادی اور جدلی آیات کے فہم کے لیے علمِ عقیدہ اور علمِ مناظرہ پڑھے۔
- اور قرآنِ کریم کے مجموعی فہم کے لیے اصولِ تفسیر کا بھی باقاعدہ مطالعہ کرے۔

ان علوم کے بغیر تفسیرِ قرآن میں پختگی اور کمال حاصل نہیں ہوسکتا۔

(باقی آئندہ)

قرآن بلا وضو چھونا

از: مولانا عبداللطیف قاسمی
جامعہ غیث الہدیٰ، بنگلور

جمہور اہل السنہ والجماعہ جن میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ، سلمان فارسیؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، حسن بصری، عطا، طاؤس، شعبی، فقہائے مدینہ اور ائمہ اربعہ رحمہم اللہ بھی شامل ہیں؛ ان کے نزدیک قرآن پاک (مصحف) کو وضو کے بغیر چھونا ناجائز اور گناہ ہے۔ (المغنی لابن قدامه، کتاب الطهارة، باب فرض الطهارة، مسئله: بدية المجتهد ونهاية المقتصد، کتاب الوضو، الباب الخامس، معرفةالافعال التی تشترط هذه الطهارة ۱/۷۳)

ائمۂ اربعہ کے مابین اس بحث کی بعض جزئیات میں اختلاف ہے، مثلاً احناف کے نزدیک کسی غلاف اور سہارے کے توسط سے چھو سکتے ہیں، شوافع کے نزدیک اس کی بھی اجازت نہیں۔

یہ مسئلہ قرآن پاک، احادیث مبارکہ، آثار صحابہ اور اقوالِ فقہاء ومجتہدین امت سے ثابت ہے، قرآن پاک کی عظمت وحرمت کا حق بھی یہی ہے کہ اس کو بلا وضو ہاتھ نہ لگایا جائے۔

حالتِ حیض ونفاس اور جنابت میں کسی بھی عالم کے نزدیک قرآن کو چھونا جائز نہیں؛ البتہ ابن حزم ظاہری نے اس کی اجازت دے دی ہے۔ (نیل الاوطار)

غیر مقلدین اور مودودی صاحب کا مذہب

بعض اہل علم جن میں حضرت انس، حضرت عبداللہ بن عباس، سعید بن جبیر، ضحاک، زید بن علی (نیل الاوطار) اور داؤد ظاہری کا مذہب یہ ہے کہ بے وضو شخص قرآن پاک کو چھو سکتا ہے؛ تاہم وضو کر کے چھونا زیادہ افضل اور باعثِ ثواب ہے۔

ہندوستانی غیر مقلدین، مودودی حضرات اور ڈاکٹر ذاکر نائک کے معتقدین بھی اسی کے قائل اور داعی ہیں،، مولانا مودودی نے ''تفہیم القرآن'' سورۃ الواقعہ کی تفسیر میں علماء کا اختلاف اور ان کے دلائل کو ذکر کرنے کے بعد سب سے آخر میں ابن حزم ظاہری کے مذہب کو بیان کیا ہے اور اسی کو ترجیح

دی ہے۔(تفہیم القرآن، الواقعہ،۵/۲۹۰)

یہ حضرات اس مسئلے پر بحث کے ذریعے قرآن پاک کی عظمت وحرمت کو لوگوں کے دلوں میں کم کرنا چاہتے ہیں، امت میں انتشار پھیلانا چاہتے ہیں اور کھلے عام لوگوں سے کہتے ہیں: قرآن پاک کو بلا وضو چھونا جائز ہے؛ حالاں کہ ان کے متقدمین بھی اس کے عدم جواز کے قائل تھے۔

سبب اختلاف

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ، فِي كِتَابٍ مَكْنُونٍ، لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ، تَنْزِيلٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ. (الواقعہ:۷۷تا۷۹)

ترجمہ: بے شک یہ عزت والا قرآن ہے جو ایک پوشیدہ کتاب میں ہے، اس کو وہی (فرشتے) چھوتے ہیں جو پاک ہیں یا وہی لوگ چھو سکتے ہیں جو حدثِ اکبر واصغر سے پاک ہیں۔

اس آیت شریفہ میں دو تفسیریں منقول ہیں:

پہلی تفسیر

یہ قرآن پاک لوح میں محفوظ لکھا ہوا ہے، اس کو پاکیزہ افراد ہی چھوتے ہیں یعنی فرشتے۔

(۱) لایمسہ کی ضمیر منصوب کتاب کی طرف راجع ہے، لایمسہ کا جملہ کتاب مکنون کی صفت ہے۔

(۲) یہ خبر ہے، حکم نہیں ہے، یہ تفسیر حضرت ابن عباسؓ اور حضرت انسؓ سے منقول ہے۔(احکام اللقرآن للطحاوی، کتاب الطھارۃ، تاویل قولہ: لایمسہ الخ)

دوسری تفسیر

قرآن کو پاک لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔(یعنی جو انسان حدث اصغر اور اکبر سے پاک ہوں)

(۱) یعنی لایمسہ کی ضمیر منصوب قرآن کی طرف راجع ہے۔

(۲) جملہ خبریہ برائے نہی ہے۔ (ملخص: بدية المجتهد ونهاية المقتصد، كتاب الوضوء، الباب الخامس، معرفة الافعال التى تشترط هذه الطهارة ۱/۷۳)

نصوص شرعیہ میں نفی کا نہی کے لیے استعمال

نصوص شرعیہ میں نفی نہی کے معنی میں بکثرت استعمال ہوتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجاً يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْراً. (البقرۃ:۲۳۴)

یہ آیت لفظاً جملہ خبر یہ ہے،اس لیے فعل مضارع پر مشتمل ہے،فعل مضارع خبر یہ کی اقسام میں سے ہے،خبر کے اعتبار سے آیت کا ترجمہ ہوگا:

متوفی عنہازوجہا چار ماہ دس دن اپنے آپ کو (نکاح جدید سے) روکیں رکھیں گی،یعنی عدت گذاریں گی۔

لیکن مقصود نہی ہے کہ چار ماہ دس دن (نکاح جدید سے) اپنے آپ کو روکے رکھو اور عدت گذارو!

علماء نے فرمایا ہے: نہی کو نفی سے تعبیر کرنے میں زیادہ مبالغہ مقصود ہوتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا يَبِيعُ بَعْضُكُمْ عَلَى بَيْعِ أَخِيهِ.(رواہ البخاری عن ابی ھریرۃؓ،کتاب البیوع،لا یبیع الرجل علی بیع اخیہ:۲۱۳۹) کوئی آدمی اپنے بھائی کی بیع پر بیع نہ کرے۔

جملہ خبر سے ان مضامین کو بیان کیا گیا؛ تاکہ اس بات کو بتایا جائے کہ مومن کی شان نہیں ہے کہ وہ کسی مسلمان کی بیع پر بیع کرے،ظلم کرے یا ضروت کے وقت اس کا ساتھ نہ دے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اس آیت سے مذکورہ بالا دونوں مطلب مستنبط ہوتے ہیں،مفسرین کی اکثریت نے آیت کے الفاظ کے عموم سے احادیث نبویہ ﷺ کو مدنظر رکھتے ہوئے ''مطہرون'' سے انسان اور باوضو شخص مراد لیا ہے۔

اکثر اہل علم کی رائے

احمد بن علی ابوبکر رازی جصاص، ملاجیون اور علامہ شامی نے دونوں تفسیریں ذکر کرنے کے بعد مندرجہ بالا تفسیر کو اکثر مفسرین کا موقف قرار دیا ہے: (احکام القرآن،تفسیرات احمدیہ، ردالمحتار، کتاب الطہارۃ،صفۃ الوضوء ۱/۱۹۷)

یعنی دوسرے احتمال کے مطابق اس آیت میں ''المطہرون'' سے وہ لوگ مراد ہیں جو حدث (اصغر واکبر) سے پاک ہوں اور یہی اکثر مفسرین کا موقف ہے۔

علامہ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد نسفی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

إن جعلتها صفة للقرآن،فالمعنى لا ينبغي ان يمسه إلا من هو على الطهارة من الناس، والمراد مس المكتوب منه. (مدارک التنزیل،الواقعۃ:۷۹)

لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ کو اگر قرآن کی صفت قرار دیا جائے،تو آیت کا معنی یہ ہوگا کہ قرآن کو وہی لوگ چھوئیں جو پاک ہوں۔

سنت نبوی سے بلا وضو قرآن کو چھونے کی ممانعت

(۱) دلیل: حضرت عمرو بن حزمؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تحریر لکھ کر عطا فرمائی تھی، اس میں دیگر متعدد احکام کے ساتھ ایک حکم یہ بھی تھا۔

اَنْ لَا يَمَسَّ الْقُرَآنَ إِلَّا طَاهِرٌ.

قرآن پاک کو صرف طاہر شخص ہی چھو سکتا ہے۔

طاہر کا اعلی مصداق وہ شخص ہے جو حدث اصغر اور حدث اکبر دونوں سے پاک ہو؛ اس لیے کہ یہی شخص طاہر کا کامل فرد اور اس کا مصداق ہے، جو شخص حدث اکبر سے پاک ہو؛ لیکن حدثِ اصغر سے پاک نہ ہو، وہ کامل طور پر پاک نہیں ہے۔

(رواہ مالک مرسلاً فی الموطا، القرآن، الامر بالوضو لمن مس القرآن: ۶۸۰، مصنف عبدالرزاق: ۱۳۲۸، والحاکم فی المستدرک، کتاب الزکوۃ: ۱۴۴۷، مرسیل ابی اداؤد: ۹۶، والدارقطنی فی سننہ، کتاب الطہارۃ، باب فی نھی المحدث عن مس القرآن: ۴۳۵، وقال: مرسل، رواتہ ثقات، و رواہ البیہقی فی السنن الکبری مسندا، کتاب الطھارۃ، باب نہی المحدث عن مس المصحف: ۴۰۹)، نیل الاوطار، کتاب الطھارۃ، باب ایجاب الوضوء للصلاۃ والطّواف ومس المصحف: ۲۶۲)

اسنادی حیثیت

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: یہ روایت مشہور ہے، اس کو تلقی بالقبول حاصل ہے۔ (تلخیص الحبیر کتاب الطہارۃ، باب الاحدث: ۱۷۵)

امام احمد بن حنبلؒ نے اس روایت کو صحیح قرار دیا ہے، غیر مقلد عالم شیخ ناصرالدین البانیؒ بھی اس کی صحت کے قائل ہیں، وہ فرماتے ہیں:

حديث ابى بكر بن محمد بن عمرو بن حزم عن ابيه عن جده: ان النبى صلى الله عليه وسلم كتب إلى اهل اليمن كتابا، وفيه: "لا يمس القرآن إلا طاهر". رواه الاثرم والدارقطنى متصلا، واحتج به احمد، وهو لمالك فى "الموطا" مرسلا: صحيح. (ارواء الغليل فى تخريج احاديث منارالسبيل:۱۲۲)

وجدت حديث عمرو بن حزم فى كتاب "فوائد ابى شعيب" من رواية ابى الحسن محمد بن احمد الزعفرانى، وهو من رواية سليمان ابن داود الذى سبق ذكره، ثم روى عن البغوى انه قال: "سمعت احمد بن حنبل وسئل عن هذا الحديث، فقال:

ارجو ان یکون صحیحا. (ارواء الغلیل فی تخریج احادیث منارالسبیل:۱۲۲)

(۲) دوسری دلیل: حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا یَمَسَّ الْقُرْآنَ إِلَّا طَاهِرًا. (رواہ البیہقی فی السنن الکبری، کتاب الطھارۃ، باب نھی المحدث عن مس المصحف:۴۱۰)

قرآن پاک کو طاہر شخص ہی چھو سکتا ہے۔

اسنادی حیثیت

امام احمد بن حنبلؒ نے زیر بحث مسئلے کے متعلق اس حدیث سے استدلال کیا ہے، حافظ ابن حجرؒ نے اس روایت کی سند کو ''لا باس بہ'' فرمایا ہے۔

قال ابن حجر:

فی الباب عن ابن عمر رواه الدارقطنی والطبرانی، وإسناده لا باس به، ذكر الاثرم ان احمد احتج به. (التلخيص الحبير: كتاب الطهارة، باب الاحدث:١٧٥)

علامہ نورالدین ہیثمی اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

رَوَاهُ الطَّبَرَانِيُّ فِي الْكَبِيرِ وَالصَّغِيرِ، وَرِجَالُهُ مُوَثَّقُونَ. (مجمع الزوائد، کتاب العلم، باب فی مس القرآن:۱۵۱۲۹)

(۳) تیسری دلیل: حضرت حکیم بن حزامؓ فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مجھے یمن کی جانب روانہ فرمایا، تو ارشاد فرمایا:

لَا تَمَسَّ الْقُرْآنَ إِلَّا وَأَنْتَ طَاهِرٌ. هَذَا حَدِيثٌ صَحِيحُ الإِسْنَادِ، وَلَمْ يُخَرِّجَاهُ. (رواہ الحاکم فی المستدرک، مناقب حکیم بن حزام:۶۰۵۱، ووفقہ الذھبی)

قرآن پاک کو بلاوضو نہ چھوؤ۔ یہ حدیث صحیح سند والی ہے؛ لیکن شیخین نے اس کی تخریج نہیں کی ہے۔

اسنادی حیثیت

امام حاکم نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے، علامہ ذہبیؒ نے امام حاکم کی موافقت فرمائی ہے، امام حازمی نے بھی اس حدیث کی سند کو حسن قرار دیا ہے۔ (تلخیص الحبیر کتاب الطھارۃ، باب الاحدث:۱۷۵)

اس روایت کی سند میں دو روای مطر الوراق اور سوید ابوحاتم ہیں جو مختلف فیہ ہیں بعض حضرات نے ان کو صدوق اور بعض نے ضعیف قرار دیا ہے، اس وجہ سے محدثین کے فیصلے بھی مختلف ہو گئے

ہیں، تائیدوتوثیق کے لیے کافی ہے۔

(۴) چوتھی دلیل: حضرت عمرؓ کے اسلام قبول کرنے کی تفصیل واقعے میں مذکور ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا:

اَعْطُونِی الْكِتَابَ الَّذِی هُوَ عِنْدَكُمْ فَاَقْرَاُ، قَالَ: وَكَانَ عُمَرُ يَقْرَاُ الْكِتَابَ، فَقَالَتْ اُخْتُهُ: إِنَّكَ رِجْسٌ، وَإِنَّهُ لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ،فَقُمْ فَاغْتَسِلْ اَوْ تَوَضَّاْ. قَالَ: فَقَامَ عُمَرُ، فَتَوَضَّاَ، ثُمَّ اَخَذَ الْكِتَابَ، فَقَرَاَ: طه. قال البيهقى: لِهَذَا الْحَدِيثِ شَوَاهِدُ كَثِيرَةٌ، وَهُوَ قَوْلُ الْفُقَهَاءِ السَّبْعَةِ مِنْ اَهْلِ الْمَدِينَةِ. (رواه البيهقى فى السنن الكبرى، كتاب الطهارة، باب نهى المحدث عن مس المصحف، فى حديث طويل:۴۱۳، ورواه الحاكم فى المستدرك، ذكر فاطمه بنت الخطاب:۶۸۹۷)

ترجمہ: مجھے وہ کتاب دو جو تمہارے پاس تھی کہ میں پڑھ کر دیکھوں، حضرت عمرؓ پڑھنا جانتے تھے، ہمشیرہ نے عرض کیا: آپ ناپاک ہیں، قرآن کو (اسی مصحف کو جسے ہم پڑھ رہے تھے) پاک لوگ ہی ہاتھ لگا سکتے ہیں، آپ جائیں، غسل کریں یا وضو کریں؛ چناں چہ حضرت عمرؓ گئے اور وضو کیا، پھر وہ مصحف (کاغذات) کو لیا اور سورۂ طٰہٰ کی تلاوت کی۔

اس واقعے میں تین حضرات صحابہ ہیں، ایک حضرت عمرؓ کی بہن جنھوں نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے، دوسرے ان کے بہنوئی سعید بن زید، تیسرے ان کے معلم حضرت خباب، معلوم ہوا کہ ان تینوں حضرات کا مذہب اور عمل یہی ہے۔

اسنادی حیثیت

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: اس روایت میں کلام ہے۔ (تلخیص الحبیر کتاب الطھارۃ، باب الاحدث:۱۷۵)

امام بیہقی فرماتے ہیں: اس روایت کے بے شمار شواہد ہیں، یہی مسلک مدینہ کے فقہائے سبعہ کا ہے۔ (گذشتہ صفحات میں صحیح روایات آئی ہیں جو اس روایت کے لیے شاہد کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان سے اس روایت کی تائید وتوثیق ہوتی ہے۔

(۵) پانچویں دلیل:

اَنَّهُ كَانَ يَنْهَى اَنْ يُسَافَرَ بِالْقُرْآنِ إِلَى اَرْضِ الْعَدُوِّ، مَخَافَةَ اَنْ يَنَالَهُ الْعَدُوُّ. (رواہ مسلم عن ابن عمرؓ، کتاب الامارۃ، باب النھی عن ان یسافر بالمصحف الی ارض العدو:۱۸۶۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دشمن کے علاقے کی جانب قرآن پاک لے کر سفر کرنے سے منع فرماتے تھے۔قرآن پاک دشمن کے ہاتھ نہ لگ جائے کہ وہ اس کی توہین کریں، ایک احتمال یہ بھی ہے کہ وہ بے وضو اس کو ہاتھ لگائیں گے، زیر بحث مسئلے کی تائید میں روایت پیش کی جاسکتی ہے۔

قرآن پاک بے وضو نہ چھونے کی دلیل عقلی

(۱) قرآن پاک کی عزت، عظمت اور محبت کا تقاضہ ہے کہ بلاوضو اس کو ہاتھ نہ لگایا جائے۔ (بدائع الصنائع، کتاب الطھارۃ، آداب الوضوء، القہقہۃ، مطلب مس المصحف ۱/۱۴۰)

(۲) کائنات میں اللہ کے کلام سے افضل کوئی کلام نہیں ہے، جب اللہ نے اپنے گھر کے طواف کے لیے طہارت کو شرط قرار دیا ہے، تو اس کے کلام کو چھونے کے لیے طہارت بدرجہ اولیٰ شرط ہونی چاہیے۔

آثار صحابہ وفتاوی

(۱) حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے بیٹے مصعب کہتے ہیں:

كُنْتُ أُمْسِكُ الْمُصْحَفَ عَلَى سَعْدِ بْنِ اَبِي وَقَّاصٍ، فَاحْتَكَكْتُ، فَقَالَ سَعْدٌ: لَعَلَّكَ مَسَسْتَ ذَكَرَكَ؟ فَقُلْتُ: نَعَمْ. فَقَالَ: قُمْ فَتَوَضَّأْ، فَقُمْتُ فَتَوَضَّأْتُ، ثُمَّ رَجَعْتُ.

(رواه البيهقى عن مصعب بن سعدؓ فى السنن الكبرى، كتاب الطهارة، باب نهى المحدث عن مس المصحف:۴۱۱)

میں مصحف پکڑ کر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا قرآن سن رہا تھا، اسی دوران میں نے کھجایا، حضرت سعدؓ نے فرمایا: شاید تم نے شرم گاہ کو ہاتھ لگایا ہے، میں نے عرض کیا: جی ہاں، آپ نے فرمایا: جاؤ دھو کر یا وضو کر کے آؤ۔ (شاید حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے نزدیک مس ذکر سے وضو ٹوٹ جاتا ہوگا)

فائدہ: مندرجہ بالا اثر میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے اپنے بیٹے کو بلاوضو قرآن چھونے سے صاف طور سے منع فرمایا ہے۔

غیر مقلد عالم دین ناصر الدین البانیؒ تحریر فرماتے ہیں کہ اس کی سند صحیح ہے۔

(ارواء الغليل فی تخریج احادیث منار السبیل:۱۲۲)

(۲) حضرت عبدالرحمٰن بن یزیدؒ فرماتے ہیں:

كُنَّا مَعَ سَلْمَانَ فَخَرَجَ، فَقَضَى حَاجَتَهُ، ثُمَّ جَاءَ فَقُلْتُ: يَا اَبَا عَبْدِ اللّٰهِ، لَوْ تَوَضَّأْتَ! لَعَلَّنَا اَنْ نَسْاَلَكَ عَنْ آيَاتٍ، قَالَ: إِنِّي لَسْتُ اَمَسُّهُ، إِنَّمَا لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ، فَقَرَاَ عَلَيْنَا

مَا شِئْنَا. (رواه البیہقی عن عبدالرحمٰن بن یزید فی السنن الکبری، کتاب الطہارۃ، باب نہی المحدث عن مس المصحف :۴۱۲)

ہم حضرت سلمان فارسیؓ کی مجلس میں تھے،آپ باہر نکلے،قضائے حاجت سے فارغ ہوکر آئے، میں نے عرض کیا:اے ابوعبداللہ! آپ وضوکر لیتے،تو بہت اچھا ہوتا! کہ ہم آپ سے قرآنی آیات سے متعلق استفادہ کرتے ،حضرت سلمانؓ نے فرمایا: میں مصحف کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا؛ (البتہ آیتیں پڑھوں گا) اس لیے کہ مصحف کو پاک (باوضو) لوگ ہی چھوسکتے ہیں؛ چناں چہ ہم نے جو چاہا، حضرت سلمانؓ نے اس کو پڑھ کر سنایا۔

فائدہ: حضرت سلمان فارسیؓ کے واقعے سے معلوم ہوا کہ حضرت سلمانؓ مطہرون سے باوضو شخص مراد لے رہے ہیں اوراسی کے موافق خود عمل کررہے ہیں اور تلامذہ کے سامنے مسئلے کی وضاحت بھی فرمارہے ہیں۔

عرب وغیر مقلد علماء کے فتاوی

(۱) غیر مقلد عالم دین عبیداللہ مبارک پوری شرح مشکوٰۃ مرعاۃ المفاتیح میں تحریرفرماتے ہیں:

کوئی بے وضوآدمی قرآن کو چھوسکتا ہے یا نہیں؟ حضرت ابن عباس، شعبی اور ضحاک جواز کے قائل ہیں، اکثر فقہاء جن میں ائمہ اربعہ بھی ہیں، عدم جواز کے قائل ہیں۔

القول الراجح عندنا، هو قول اكثر الفقهاء، وهو الذى يقتضيه تعظيم القرآن وإكرامه. والمتبادر من لفظ الطاهر فى هذا الحديث هو الطاهر من الحدث الاصغر. اى: المتوضى، وهو الفرد الكامل للطاهر. (مرعاۃ المفاتیح، کتاب الطہارہ، باب مخالطۃ الجنب ومایباح لہ، الفصل الثانی:۴۶۹)

ترجمہ: میرے نزدیک راجح اکثر فقہاء کا قول ہے،قرآن پاک کی تعظیم اور تکریم کا تقاضا بھی یہی ہے، حضرت عمر بن حزمؓ کی روایت میں لفظ''طاہر''سے مراد باوضو شخص ہے؛اس لیے کہ یہی شخص طاہر کا اصلی مصداق ہے کہ وہ حدث اصغر سے بھی پاک ہوتا ہے اور حدث اکبر سے بھی۔

(۲) شیخ عبدالعزیز بن بازؒ نے بھی سورۃ الواقعہ کی آیت، حضرت عمرو بن حزمؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایات اور حضرت سلمان فارسیؓ کے عمل سے استدلال کرتے ہوئے جمہور اہل علم کے مذہب کو راجح قرار دیا ہے۔ (مجموعۃ فتاوی ابن باز، المجلد الثانی، حرمۃ القرآن)

(۳) جامعہ اسلامیہ مدینۃ المنورہ اور جامعہ ام القری کے مجلّات نے جمہور اہل علم اور ائمہ اربعہ

کے مذہب کوراجح قرار دیتے ہوئے لکھا ہے: ائمہ اربعہ کی دلیل نہایت مضبوط اور قابل قدر ہے۔ (مجلۃ الجامعۃ الاسلامیۃ: العدد: ۱۱۵ تابع لاحکام اللمس، مجلۃ جامعۃ ام القری: العدد: ۲۴، من احکام مس القرآن الکریم)

(۴) شیخ ناصرالدین البانی نے بھی ''ارواء الغلیل'' میں باب سے متعلق تمام روایات پر بالتفصیل کلام کرنے کے بعد اسی مذہب کو ترجیح دیتے ہوئے لکھا ہے: ان روایات کی صحت پر دل مطمئن ہے۔(ارواء الغلیل فی تخریج احادیث منار السبیل: ۱۲۲)

(۵) ان حضرات کے علاوہ شیخ محمد بن صالح العثیمن اور شیخ صالح بن فوزان بھی یہی فتوی دیا کرتے تھے۔

ماضی قریب کے عرب وعجم کے غیر مقلد علماء بھی اس مسئلے میں جمہور امت کے ساتھ ہیں۔

ہندوستانی غیر مقلدین اور مودودی صاحب کے شبہات وجوابات

ابن حزم، داؤد ظاہری اور بعض غیر مقلدین علماء کا کہنا ہے کہ بے وضو شخص کے لیے قرآن پاک کو چھونے کے لیے وضو کے لازم ہونے کی کوئی دلیل کتاب وسنت میں نہیں ہے؛ لہٰذا مسئلے کی بنیاد اباحت اصلیہ پر ہوگی۔

إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ، فِي كِتَابٍ مَكْنُونٍ، لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ، تَنْزِيلٌ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ. (الواقعہ: ۷۷تا۷۹)

سورۂ الواقعہ کی مندرجہ بالا آیات کا مطلب یہ ہے کہ قرآن پاک لوح محفوظ میں ہے، اسے صرف پاک نفوس ہی چھو سکتے ہیں اور وہ صرف فرشتے ہیں، شیطان کو وہاں تک رسائی حاصل نہیں، آیت میں ''مطہرون'' سے مراد صرف فرشتے ہیں، بے وضو لوگ مراد نہیں ہیں۔

بعض حضرات نے آیت کے شان نزول سے استدلال کیا ہے کہ کفار مکہ کہا کرتے تھے: محمد کے پاس شیطان وحی لاتا ہے، اس کی تردید کے لیے اللہ تعالیٰ نے مندرجہ بالا آیات کو نازل فرمایا۔

جواب

جمہور مفسرین کے نزدیک اصول تفسیر کا ایک مسلمہ اور مشہور قاعدہ ہے:

العبرة لعموم اللفظ لالخصوص السبب.

ترجمہ: لفظ کے عموم کا اعتبار ہوتا ہے نہ کہ خاص سبب (نزول) کا۔

قال السيوطي: اخْتَلَفَ أَهْلُ الْأُصُولِ: هَلِ الْعِبْرَةُ بِعُمُومِ اللَّفْظِ أَوْ بِخُصُوصِ السَّبَبِ؟

وَالْاَصَحُّ عِنْدَنَا الْاَوَّلُ وَقَدْ نَزَلَتْ آيَاتٌ فِي اَسْبَابٍ وَاتَّفَقُوا عَلَى تَعْدِيَتِهَا إِلَى غَيْرِ اَسْبَابِهَا كَنُزُولِ آيَةِ الظِّهَارِ فِي سَلَمَةَ بْنِ صَخْرٍ وَآيَةِ اللِّعَانِ فِي شَاْنِ هِلَالِ بْنِ اُمَيَّةَ وَحَدِّ الْقَذْفِ فِي رُمَاةِ عَائِشَةَ ثُمَّ تَعَدَّى إِلَى غَيْرِهِمْ. وَمَنْ لَمْ يَعْتَبِرْ عُمُومَ اللَّفْظِ قَالَ: خَرَجَتْ هَذِهِ الْآيَاتُ وَنَحْوُهَا لِدَلِيلٍ آخَرَ كَمَا قُصِرَتْ آيَاتٌ عَلَى اَسْبَابِهَا اتِّفَاقًا لِدَلِيلٍ قَامَ عَلَى ذَلِكَ.

(الاتقان فی علوم القرآن، النوع التاسع: معرفۃ سبب النزول: ۱/۶۳)

یعنی قرآن کے معنی ومفہوم کو متعین کرنے میں قرآنی الفاظ کے عموم کا اعتبار ہوتا ہے، آیت کے نزول کے پس منظر کا اعتبار نہیں کیا جاتا ہے، قرآن پاک میں لفظ "تطہر" "اطہر" انسانوں کے لیے استعمال کیا گیا ہے، حدث اصغر اور حدث اکبر سے پاکی حاصل کرنے اور انسانی دلوں کو روحانی امراض سے پاک کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔

(۱) سورۃ المائدہ میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے:

وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا، فَاطَّهَّرُوا. (المائدۃ:۶)

نماز کے لیے وضو کرو، اگر حالتِ جنابت میں ہو، تو خوب پاکی حاصل کرو، یعنی غسل کرو۔

(۲) حائضہ عورتوں سے صحبت کرنے سے متعلق بیان کیا گیا ہے:

وَلَا تَقْرَبُوهُنَّ حَتَّى يَطْهُرْنَ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ، اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ. (البقرۃ:۲۲۲)

جب حائضہ عورتیں خوب پاک ہوجائیں، تو تم ان سے صحبت کرسکتے ہو، یعنی ظاہری اعتبار سے حیض بند ہوچکا ہو اور غسل بھی کرلیا گیا ہو، تو تم بیویوں سے صحبت کرو۔

(۳) اللہ تعالیٰ نے اہل قبا کی تعریف فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ اَنْ يَتَطَهَّرُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ. (التوبہ:۱۰۸)

قبا میں ایسے لوگ ہیں جو خوب پاکی حاصل کرنا چاہتے ہیں، اللہ تعالیٰ خوب پاکی حاصل کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔

اس آیت میں استنجے کے وقت ڈھیلے اور پانی سے استنجا کرنے کی تعریف فرمائی ہے، معلوم ہوا کہ چھوٹے اور بڑے استنجا کے موقع پر پاکی حاصل کرنے میں مبالغہ کرنے کے لیے "مطہرین" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

(۴) اللہ تعالیٰ حضرات امہات المومنین کو خطاب فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا. (الاحزاب:۳۳)

اللہ تم اہل بیت سے رجس کو دور کرنا چاہتا ہے اور تمہیں خوب پاک وصاف کرنا چاہتا ہے۔

یعنی عام انسانوں کی بنسبت تمہارے اندر خوبیاں زیادہ پیدا کرنا چاہتا ہے، دنیوی رزائل سے پاک رہنا چاہتا ہے۔

مذکورہ بالا آیات میں لفظ ''تطہر'' اور ''متطھرون'' یقیناً انسانوں ہی کے لیے استعمال کیا گیا ہے، لہٰذا سورۃ الواقعہ کی آیت میں انسان مراد ہوں گے، اگرچہ آیت کے عموم میں فرشتے بھی داخل ہیں؛ لیکن آیت کے مفہوم ومراد کو صرف فرشتوں کے ساتھ خاص کردینا، بے وقوفی اور لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا ہے۔

حدیث سے غیر مقلدین کی دلیل

(۱) كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَذْكُرُ اللهَ عَلَى كُلِّ أَحْيَانِهِ. (رواہ مسلم عن عائشةؓ، کتاب الحیض، باب ذکراللّٰہ فی حال الحیض: ۳۷۳)

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت اللہ کا ذکر کرتے تھے۔

قرآن پاک ذکر ہے، لہٰذا باوضو، بے وضو قرآن کو چھونا جائز ہوگا؛ اس لیے کہ بعض اوقات آدمی قرآن کو چھوکر تلاوت کرتا ہے، معلوم ہوا کہ قرآن کے چھونے کے لیے وضو ضروری نہیں ہے۔

جواب

اس روایت کا جواب یہ ہے کہ مطلق ذکر سے ذکر لسانی مراد ہوتا ہے، یہاں وہی مراد ہے، ذکر سے عام معنی مراد نہیں، ورنہ نماز بھی بلا وضو درست ہونی چاہیے؛ اس لیے کہ قرآن پاک میں نماز جمعہ کے لیے لفظ ذکر کا استعمال کیا گیا ہے، چناں چہ ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِنْ يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ. (الجمعہ:۹)

اے ایمان والو! جب نماز جمعہ کی اذان دی جائے، تو اللہ کے ذکر (نماز جمعہ وخطبہ) کے لیے سعی کرو۔

(۲) دوسری دلیل

حضرت ابن عباسؓ کی طویل روایت جو ہرقل شاہ روم کی جانب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعوتی تحریر روانہ فرمائی تھی، اس میں مندرجہ ذیل آیت بھی لکھی گئی تھی۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَنْ لَا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ

شَیْئًا وَلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللّٰہِ، فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْہَدُوا بِاَنَّا مُسْلِمُونَ.
(آل عمران:۶۴)

حالاں کہ آپ ﷺ کو معلوم ہے کہ رومی اس خط کو ہاتھ لگائیں گے، پھر بھی آپ ﷺ نے ان کی جانب روانہ فرمایا، جب ایک آیت کو بلا وضو چھونا جائز ہوا، تو ایک سے زائد آیات کو چھونا بھی جائز ہے۔

جواب

جس مکتوب میں قرآنی آیات کی مقدار کم ہو، علماء نے اس کو بلا وضو چھونا درست قرار دیا ہے، اس لیے کہ اس میں قرآنی آیات مقصود نہیں ہوتی ہیں؛ بلکہ دیگر مضامین مقصود اور قرآنی آیات ان کے تابع ہوتی ہیں، کسی تحریر، کتاب یا مضمون میں ایک دو، یا چند آیات لکھ دینے سے وہ چیز مصحف نہیں بن جاتی، نہ لکھنے والے اس کو مصحف سمجھتے ہیں، نہ پڑھنے والے، جب اس کو مصحف نہیں سمجھا گیا، اس پر مصحف کا اطلاق نہیں ہوتا ہے، اس کو چھونے کے لیے وضو لازم بھی نہیں ہوگا، اسی وجہ سے دینی کتابوں کو بلا وضو چھونا جائز اور درست ہے۔

(۳) تیسری دلیل

حضرت عمر بن حزمؓ کی روایت میں ''طاہر'' سے مومن مراد ہے، حضرت ابو ہریرۃؓ کی روایت میں مذکور ہے، مومن نجس نہیں ہوتا ہے۔

إِنَّ الْمُسْلِمَ لَا یَنْجُسُ۔(رواہ البخاری عن ابی ھریرۃ، کتاب الغسل، باب عرق الجنب:۲۸۳)

جواب

مشرک کو اعتقادی اعتبار سے نجس کہا گیا ہے جیسے اس آیت میں مذکور ہے:

یَا اَیُّہَا الَّذِینَ آمَنُوا إِنَّمَا الْمُشْرِکُونَ نَجَسٌ. (التوبہ:۲۸)

اے ایمان والو! مشرکین ناپاک ہیں۔

مومن اعتقادی اعتبار سے کفر وشرک سے پاک ہوتا ہے، جب وہ بے وضو اور بے غسل ہوتا ہے، تو حکماً ناپاک ہوتا ہے، بدن پر کوئی نجاست نہیں ہوتی؛ بلکہ وہ حکماً وشرعاً ناپاک ہوتا ہے، اسی وجہ سے وہ کسی چیز کو ہاتھ لگائے، تو وہ چیز ناپاک نہیں ہوتی، اس کا پسینہ اور جھوٹا پاک ہوتا ہے، جب حکماً وشرعاً ناپاک ہے، تو وہ قرآن کو چھو نہیں سکتا۔

روایت میں لفظ طاہر استعمال ہوا، شریعت بے وضو اور بے غسل شخص کے لیے طاہر کا لفظ استعمال کرتی ہے، جیسا کہ گذشتہ صفحات میں بالتفصیل ذکر کیا گیا۔

حضرت براء بن عازبؓ کی روایت میں لفظ ''طاہر'' صاف طور پر باوضو شخص کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔

حضرت براء فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا:

إِذَا أَوَيْتَ إِلَى فِرَاشِكَ وَأَنْتَ طَاهِرٌ فَتَوَسَّدْ يَمِينَكَ. (رواه ابو داود عن البراءؓ، كتاب الآداب، باب مايقال عندالنوم: ۵۰۴۷)

تم اپنے بستر پر باوضو آؤ، تو اپنے داہنے ہاتھ کو تکیہ بنالو۔

(۴) چوتھی دلیل

بے وضو شخص قرآن پاک کی تلاوت کرسکتا ہے، تو اس کو چھو بھی سکتا ہے۔

جواب

قرآن کے چھونے کو اس کی تلاوت پر قیاس کرنا درست نہیں ہے؛ اس لیے کہ وضو کے ٹوٹنے کی وجہ سے جو حدث متوضی کے بدن پر ظاہر ہوتا ہے، وہ زبان پر ظاہر نہیں ہوتا، اسی وجہ سے وضو میں منہ، ہاتھ اور پاؤں دھونا فرض ہے، زبان کو دھونا فرض نہیں ہے۔ (بدائع، كتاب الطهارة، مطلب: لقهقهة فى الصلاة ۱/۱۴۱)

(۵) پانچویں دلیل

چھوٹے بچوں کو ناظرہ قرآن وحفظ قرآن کی غرض سے بلا وضو قرآن کو چھونے کی اجازت سب کے نزدیک ہے، ان کو وضو کا پابند نہیں کیا جاتا؛ بلکہ نظر انداز کردیا جاتا ہے، اسی طرح بڑوں کو بھی بلا وضو چھونے کی اجازت ہونی چاہیے۔

جواب

چھوٹے بچے غیر مکلّف ہیں، ضرورت کی وجہ سے انھیں بلا وضو چھونے کی اجازت دی گئی ہے، وضو کا مکلّف کیا جائے، تو اس پر عمل کا اہتمام نہیں کرسکیں گے اور تعلیمِ قرآن سے محروم رہیں گے۔

صحابۂ کرام کے ان اقوال کو اہل حدیث حجت نہیں مانتے جو نص صحیح کے خلاف ہوں؛ کیونکہ صحابۂ کرام بھی بہرحال انسان تھے اور معصوم عن الخطاء صرف انبیاء علیہ السلام کی ذات قدسیہ ہیں۔ بالکل یہی موقف احناف کا بھی ہے ان کے ہاں بھی احادیث صحیحہ سے تصادم کے نتیجے میں صحابہ کے اقوال حجت نہیں رہتے۔

بعض حضرات صحابہ اور تابعین کے اقوال سے استدلال

زیر بحث مسئلے میں غیر مقلدین اور مودودی حضرات بعض حضرات صحابہ اور تابعین کے اقوال سے استدلال کرتے ہیں کہتے ہیں: بے وضو قرآن کو چھونا جائز ہے۔

جواب

آپ نے حضرات نے زیر بحث مسئلے میں ملاحظہ فرمایا ہے کہ جمہور امت کے نزدیک قرآن، حدیث اور صحابہ کے اقوال موجود ہیں، ان حضرات کے نزدیک ایک بھی صریح حدیث مرفوع نہیں ہے، سورۃ الواقعہ کی آیت کی تفسیر میں بعض حضرات صحابہ اور تابعین کے اقوال ہیں، اصول حدیث کا مشہور ضابطہ ہے کہ جب قول صحابی حدیث مرفوع سے معارض ہو، تو حدیث کو لیا جائے گا، احادیث مرفوعہ کے ہوتے ہوئے قول صحابی حجت نہیں، تو قول تابعی اور تبع تابعی بدرجہ اولیٰ حجت نہیں ہوگا۔

مولانا ظفر احمد تھانوی دیوبندی فرماتے ہیں:

لا حجة فی قول الصحابی فی معارضة المرفوع، لاسیما اذا کانت المسئلة مختلف فیها بین الصحابة. (اعلاء السنن، کتاب الطهارة، باب آداب الاستنجاء: ۴۱۳)

صحابی کا قول ہمارے نزدیک حجت ہے جب مرفوع حدیث کے خلاف نہ ہو(اعلاء السنن ص126، ج1) جب صحابی کا قول حدیث مرفوع کے معارض ہو، تو حجت نہیں ہوگا، بالخصوص جب کہ وہ مسئلہ صحابۂ کرام میں مختلف فیہ ہو۔(اعلاء السنن، ص438، ج01، باب آداب الاستنجاء)

جو حضراتِ صحابہ اور تابعین بلا وضو قرآن کو چھونے کے قائل ہیں؛ چوں کہ وہ احادیث مرفوعہ صحیحہ اور حسن کے معارض ہیں؛ اس لیے ان کو نہیں لیا جائے گا؛ صحابۂ کرام بھی بہر حال انسان تھے اور معصوم عن الخطاء صرف انبیاء علیہ السلام کی ذات قدسیہ ہیں؛ لہٰذا احادیث صحیحہ سے تعارض کے موقع پر صحابہ کے اقوال حجت نہیں ہوں گے۔

اس باب میں بلا وضو قرآن کو چھونے کے باب میں کوئی مرفوع روایت موجود نہیں ہے، اقوال صحابہ و تابعین ہیں، اس کے برخلاف وضو کے ضروری ہونے میں احادیث مرفوعہ صحیحہ وحسنہ موجود ہیں۔

خلاصۂ کلام

جمہور امت اور ائمہ اربعہ کا مذہب نہایت قوی اور راجح ہے، صحیح، حسن اور قابل استدلال احادیث، متعدد حضرات صحابہؓ کے عمل وفتاوی اور قیاس سے ثابت و موید ہے اور امت میں معمول بہا ہے؛ حتیٰ کہ غیر مقلد علماء بھی اسی کے قائل ہیں، گویا ہم کہہ سکتے ہیں: جمہور امت کا مذہب قرآن،

سنت، اجماع اور قیاس سے ثابت ہے۔

(۱) سورۃ الواقعہ کی آیت جمہور کے مذہب کے ثبوت کے لیے قوی احتمال رکھتی ہے، اکثر مفسرین نے غیر متوضی کے لیے مس قرآن کے ناجائز ہونے کو ترجیح دی ہے۔

(۲) حضرت عمرو بن حزمؓ کی روایت کو امام احمد بن حنبلؒ نے صحیح، امام حازمیؒ نے حسن قرار دیا اور حافظ ابن حجرؒ مشہور تلقی بالقبول کی بات کہی ہے۔

(۳) حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت کو حافظ ابن حجرؒ نے: ''لا باس بہٖ'' کہا ہے، امام احمد بن حنبلؒ نے اس روایت سے استدلال کیا ہے۔

(۴) حضرت حکیم بن حزامؓ کی روایت کو امام حاکمؒ نے صحیح کہا ہے، علامہ ذہبی نے ان کی موافقت کی ہے۔

(۵) حضرات صحابہ کے فتاوی اور عمل۔

(۶) امت کا تعامل۔

اس کے برخلاف بعض نام نہاد اہل حدیث کا مذہب محض تاویلات، شبہات، احادیث صحیحہ پر عمل ترک کرنے اور سہولت اختیار کرنے پر موقوف ہے، ان کا مقصد امت میں قرآن کی عظمت ومحبت کو کم کرنا، امت میں افتراق وانتشار پیدا کرنا اور امت کو قرآن سے دور کر کے اعدائے اسلام کے مشن کو پورا کرتے ہوئے ان کو خوش کرنا ہے۔

نوٹ: اس مقالے میں بکثرت عرب اور غیر مقلد علماء کے اقوال کا ذکر اپنے مذہب کی تائید اور عمل بالحدیث کا دعوی کرنے والوں کو ایک آئینہ دکھانے کی غرض سے کیا گیا ہے۔

* * *

اجتہاد وتقلید: کچھ ابتدائی باتیں

از: مفتی محمد طارق محمود
مدرس ومعین مفتی جامعہ عبداللہ بن عمر، لاہور

اجتہاد وتقلید ایک اہم موضوع ہے، جسے اچھی طرح نہ سمجھنے سے شبہات پیش آتے ہیں اور صحیح راستے سے ہٹنے کا اندیشہ ہوجاتا ہے۔اس موضوع پر کچھ ابتدائی باتیں پیش خدمت ہیں۔امید ہے یہ مضمون اس بارے میں عوام اور طلبا، دونوں کے لیے ابتدائی سبق بنے گا۔

دینِ اسلام کے دو حصے: منصوص اور اجتہادی

اللہ تعالی نے اپنی حکمت سے دینِ اسلام کے دو حصے مقرر فرمائے ہیں: ایک حصہ وہ جن میں ایک طے شدہ حکم ہے اور اس میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔مثلاً توحید، رسالت، آخرت، نماز کا فرض ہونا اور زنا کا حرام ہونا وغیرہ۔یہ اسلام کا بنیادی حصہ ہے۔ایسے حکم کو منصوص کہتے ہیں۔دوسرا حصہ وہ ہے جن میں ایک طے شدہ حکم نہیں ؛ بلکہ اہلِ اختلاف کے لیے اختلاف کی گنجائش ہے۔ مثلاً خون نکلنے سے وضوٹوٹتا ہے یا نہیں؟ مقتدی کو قرارت کرنی چاہیے یا نہیں؟ آمین بلند آواز سے کہنی چاہیے یا پست آواز سے؟ وغیرہ۔یہ اسلام کا تکمیلی حصہ ہے۔ایسے حکم کو اجتہادی اور مجتہد فیہ کہتے ہیں۔شیخ عبدالعزیز بخاری (م۷۳۰ھ) مجتہد فیہ کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں: والمُجتَهَد فيه هو الحكم الشرعي الذى لا قاطع فيه. (کشف الاسرار:۲۰/۴) مجتہد فیہ وہ حکمِ شرعی ہے جس میں کوئی (دلیلِ) قطعی (یقینی) نہ ہو۔(یعنی اس کی دلیل ثبوت یا دلالت کے اعتبار کے ظنی ہو)۔پس جس حکم کی دلیل ثبوت اور دلالت دونوں لحاظ سے قطعی ہو اور غیر منسوخ ہو وہ اجتہادی نہیں۔پھر دلیلِ شرعی کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ثبوت اور دلالت۔دونوں پہلوؤں میں دو دو درجے ہوتے ہیں۔ادنیٰ اور اعلیٰ۔ادنیٰ ظنی ہے اور اعلی قطعی ہے۔ظنی میں دوسری جانب کا احتمال ہوتا ہے اور قطعی میں نہیں

ہوتا؛ البتہ دلیل کے ظنی اور قطعی ہونے کا علم بسا اوقات اس پر موقوف ہوتا ہے کہ اس کے معارض کوئی دلیل ہے یا نہیں؟ اور یہ بات استقرائے شریعت سے معلوم ہوتی ہے اور یہ کام مجتہد کا ہے۔ غیر مجتہد کا استقرا، معتبر نہیں۔ (دیکھیے: شرح تنقیح الفصول للقرافی: ص ۴۵۰، تربیت السالک: جزو دوم سوم: ص ۱۲۱۶) اس سے معلوم ہوا کہ دلیل کو کماحقہ جاننا کہ تعارض، نسخ، تاویل اور ترجیح وغیرہ یہ مجتہد کا خاصہ ہے۔ (نیز دیکھیے: فتاویٰ ثنائیہ: ۱/۲۶۳)

اسلام میں اجتہاد کی گنجائش کیوں؟

باری تعالیٰ کو اس پر پوری قدرت ہے کہ وہ دین کے سب احکام ایسے فرما دیتے کہ اجتہاد کی ضرورت باقی نہ رہتی۔ حضرت تھانوی فرماتے ہیں: بہت ممکن تھا کہ وحی ہر ہر جزئی کا حکم صاف صاف بتا دیتی؛ مگر حق تعالیٰ کو منظور یہ ہوا کہ اجتہاد کا اجر بھی بندوں کو دیا جائے۔ اس واسطے قصداً استنباط کی ضرورت رکھ دی۔ ورنہ وحی ہر ہر جزئی کا حکم بیان کر سکتی تھی؛ لیکن بہت سے بہت یہ ہوتا کہ کتاب اللہ بہت ضخیم ہو جاتی! تو یہ کیا مشکل تھا؟ رہا یہ شبہ کہ واقعات تو غیر متناہی ہیں تو ان کے احکام بھی غیر متناہی ہوں گے اور وہ کتاب بھی غیر متناہی ہوگی اور پڑھنے والوں کی عمر بھی غیر متناہی ہونی چاہیے! سو واقعات کا غیر متناہی ہونا مسلّم نہیں؛ کیونکہ نبی اکرم ﷺ سے لے کر نفخ صور تک کا زمانہ متناہی ہے اور واقعات بھی محدود ہیں۔ (خطبات حکیم الامت: ۲۶/۲۷، ۲۸ بتلخیص)

اجتہاد، تقلید اور اتباع کے معنی

اجتہاد اور تقلید کی تفصیل دراصل علمِ اصولِ فقہ میں بیان ہوتی ہے اور یہ دونوں لفظ اس علم کی اصطلاحات میں سے ہیں۔ مثلاً ابوبکر جصاص حنفی (م ۳۷۰ھ) کی الفصول فی الاصول میں ہے: باب القول في صفة من يكون من أهل الاجتهاد (جو اہل اجتہاد ہے اس کی شرائط کا باب) اور باب القول في تقليد المجتهد (مجتہد کی تقلید کا باب) اور خطیب بغدادی شافعی (م ۴۶۳ھ) کی اصول فقہ پر کتاب الفقیہ والمتفقہ میں ہے: باب الكلام في التقليد وما يسوغ منه ومالا يسوغ (تقلید کے بارے میں کلام اور اس میں کونسی جائز ہے اور کونسی ناجائز؟) اور باب القول في من يسوغ له التقليد ومن لا يسوغ. (کس کے لیے تقلید جائز ہے اور کس کے لیے نہیں؟) اجتہاد کی تعریف یہ ہے: الاجتهاد بذل الطاقة من الفقيه في تحصيل حكم

شرعي ظني. (فواتح الرحموت:۲/۴۰۴) اجتہاد فقیہ کے، حکم شرعی ظنی حاصل کرنے میں، اپنی پوری طاقت صرف کرنے کو کہتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ (م۱۱۷۶ھ) فرماتے ہیں: حقيقة الاجتهاد على مايفهم من كلام العلماء استفراغ الجهد فى ادراك الأحكام الشرعية الفرعية من وأدلتها التفصيلية الراجعة كلياتها الى أربعة أقسام الكتاب والسنة والاجماع والقياس. (عقد الجید:ص۳) اجتہاد کی حقیقت جو علماء کے کلام سے معلوم ہوتی ہے، یہ ہے کہ احکام شرعیہ فرعیہ کو ان کے تفصیلی دلائل سے حاصل کرنے کی پوری کوشش کرنا، تفصیلی دلائل بنیادی طور پر چار ہیں: کتاب، سنت، اجماع اور قیاس۔ پس جو ادلہ اربعہ سے براہ راست دلیل لینے کی صلاحیت رکھتا ہو اسے مجتہد کہتے ہیں۔ (دیکھیے: النبراس:ص۲۷) تقلید کی تعریف میں اہلِ اصول میں کچھ اختلاف ہے۔ (دیکھیے: التقریر والتحبیر:۳/۳۴۰، ۳۴۱ تیسیر التحریر:۴/۲۴۲) لیکن اس وقت تقلید کے ایک خاص فرد سے بحث مطلوب ہے یعنی غیر مجتہد کے لیے مجتہد کا قول لینا۔ (لكن العرف) دل (على أن العامى مقلد للمجتهد) بالرجوع اليه. (قال الامام) امام الحرمين (وعليه معظم الأصوليين) وهو المشتهر المعتمد عليه. (فواتح الرحموت: ۲/۴۳۲) لیکن عرف سے معلوم ہوتا ہے کہ عامی مجتہد کا مقلد ہے اس سے رجوع کرکے۔ امام الحرمین کہتے ہیں جمہور اصولیین اسی پر ہیں اور یہی مشہور معتمد علیہ ہے۔ حضرت تھانوی فرماتے ہیں: لفظ تقلید فنون شرعیہ میں بوجہ اصطلاح (ہونے) کے، لغوی معنی میں مستعمل نہیں۔ اور اتباع میں کوئی اصطلاح منقول نہیں؛ اس لیے وہ اپنے لغوی معنی میں مستعمل ہے۔ اور اس کے لغوی معنی ظاہر ہے کہ تقلید سے عام ہیں ۔۔۔۔۔ اور تقلید کی اصطلاحی تفسیر میں گو کچھ اختلاف بھی ہو؛ مگر ہر تفسیر پر وہ خاص ہے اتباعِ مجتہد کے ساتھ محض دلیلِ اجمالی کی بنا پر بلا انتظار دلائلِ تفصیلیہ کے ۔۔۔۔۔ اور حاصل قائلین بالاتحاد والتباین کا (یعنی تقلید اور اتباع کو ایک یا مختلف کہنے والوں کا) نزاعِ لفظی ہے جو تابع ہے تفسیر الفاظ کا، جس سے احکام واقعیہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ حق حق ہے چاہے اس کا نام کچھ رکھ لیا جائے اور باطل باطل ہے خواہ اس کا نام کچھ رکھ دیا جائے۔ (امداد الفتاوی:۴/۲۰۶، ۲۰۷) (نیز دیکھیے: تجلیاتِ صفدر:۳/۵۰۴، ۵۰۵ مولانا بٹالوی کا قول)

تقلید کی تعریف کا آسان خلاصہ وہ ہے جو مولانا زکریا فرماتے ہیں: تقلید کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ فروعی مسائل فقہیہ میں غیر مجتہد کا مجتہد کے قول کو تسلیم کر لینا اور اس سے دلیل کا مطالبہ نہ کرنا اس اعتماد پر کہ مجتہد کے پاس دلیل ہے۔ (شریعت وطریقت کا تلازم:ص۶۵) قرآن وحدیث

پر عمل کرنا ہی ہر مسلمان کا مقصودِ اصلی ہے۔ جو کسی امامِ مجتہد کو واسطہ فی التفہیم بنا کر قرآن وحدیث پر عمل کرتا ہے اس کا عمل بالقرآن والسنۃ کامل ہے۔اور جو اپنی سمجھ سے قرآن وحدیث پر عمل کرتا ہے اس کا عمل ناقص ہے؛ کیونکہ سلف صالحین علم وعمل میں ہم سے بہت بڑھے ہوئے تھے۔(دیکھیے: خطباتِ حکیم الامت: ۱۵/۳۱،۳۲) لہٰذا فقہی مذاہب کے پیروکاروں کے بارے میں یہ سمجھنا بدگمانی اور بدزبانی ہے کہ وہ اپنے ائمہ کو شارع اور مُطاعِ مستقل سمجھتے ہیں۔ ہرگز نہیں؛ بلکہ صرف شارح اور قانون دان سمجھتے ہیں۔(تقلیدِ منطقی اور تقلیدِ فقہی میں فرق: دیکھیے: تربیت السالک: جز ودوم، سوم: ص۱۲۱۴،۱۲۱۵)۔

عامی کے براہِ راست ظاہرِ حدیث پر عمل کرنے کے بارے میں امام ابو یوسف فرماتے ہیں: وقال (أی الامام أبویوسف): لأن العامی اذا سمع حدیثًا لیس له أن یأخذ بظاهره لجواز أن یکون مصروفا عن ظاهره أو منسوخا بخلاف الفتوی.(الکفایۃ فی شرح الهدایۃ: ۲/۱۵۸، دارالکتب العلمیۃ، بیروت ط:۲۰۱۹ء) عامی جب کوئی حدیث سنے تو اس کے ظاہری معنی پر عمل کرنے کی اسے اجازت نہیں؛ کیونکہ حدیث کے کبھی کبھی ظاہری معنی مراد نہیں ہوتے اور کبھی منسوخ ہوتی ہے، برخلاف فتوی کے۔(غیر المجتهد المطلق ولو) کان (عالما یلزمه التقلید) لمجتهد ما .... (لنا: المجتهدون من الصحابة وغیرهم) من التابعین (کانوا یفتون من غیر ابداء المستند ویتبعون من غیر نکیر) ... (وشاع) ذلك و(ذاع) حتی تواتر.(فواتح الرحموت: ۲/۴۳۴) جو مجتہد مطلق نہ ہو، اگرچہ عالم ہو اسے کسی مجتہد کی تقلید لازم ہے۔۔۔اس کی دلیل یہ ہے کہ صحابہ اور تابعین کے مجتہدین بغیر دلیل بیان کیے فتوی بتاتے تھے اور بلانکیر ان کی پیروی ہوتی تھی اور یہ بات مشہور ومعروف ہے حتی کہ حدِ تواتر کو پہنچتی ہے۔الحاصل مطلق تقلید کے وجوب کی دلیل اجماع ہے۔

ابن خواز منداد مالکی (م۳۹۰ھ) نے تقلید کی تعریف یوں کی ہے:التقلید معناه فی الشرع الرجوع الی قول لاحجة لقائله علیه وذلك ممنوع منه فی الشریعة والاتباع ما ثبت علیه حجة وقال فی موضع آخرمن کتابه: کل من اتبعت قوله من غیر أن یجب علیك قبوله بدلیل یوجب ذلك فأنت مقلده والتقلید فی دین اللّٰه غیر صحیح وکل من أوجب الدلیل علیك اتباع قوله فأنت متبعه والاتباع فی الدین مسوغ والتلقید ممنوع.(اعلام الموقعین: ۳/۴۶۴) تقلید کے شرعی معنی ایسے قول کی طرف رجوع کرنا جس کے قائل کی کوئی دلیل نہ

ہواور یہ شریعت میں ممنوع ہے۔ اور اتباع وہ ہے جس پر دلیل قائم ہو۔ اور اپنی کتاب میں ایک اور جگہ کہا ہے: جس کے قول کی بھی تم نے پیروی کی، بغیر اس کے کہ اس کا قول قبول کرنے کی کوئی دلیل ہو تو تم اس کے مقلد ہو اور اللہ کے دین میں تقلید ممنوع ہے اور جس کے قول کی پیروی دلیل سے ثابت ہو تو تم اس کے متبع ہو۔ دین میں اتباع جائز اور تقلید ممنوع ہے۔

حاصل یہ کہ تقلید کی دو تعریفیں ہوئیں۔ ایک جمہور اصولیین کی، دوسری ابن خواز کی۔ دونوں تعریفوں کے موازنے سے درج ذیل امور سامنے آتے ہیں:

۱: غیر مجتہد کے لیے مجتہد کا قول لینا جمہور اصولیین کی تعریف کے مطابق تقلید ہے، اور ابن خواز کی تعریف کے مطابق یہ اتباع ہے، تقلید نہیں۔

۲: دونوں تعریفوں میں نزاع لفظی ہے، کیونکہ غیر مجتہد کے لیے مجتہد کے قول کا حجت ہونا دلیل شرعی سے ثابت ہے، خواہ اسے تقلید کہا جائے یا اتباع کہا جائے۔

۳: تقلید کے بارے میں اثباتاً یا نفیاً کلام کرنے والے کو پہلے اس کی تعریف واضح طور پر متعین کرنی چاہیے۔ نیز جامع بیان العلم لابن عبدالبر (م۴۶۳ھ) اور اعلام الموقعین لابن القیم (م۷۵۱ھ) میں جو اتباع اور تقلید میں فرق بیان کیا گیا ہے وہ ابن خواز کی تعریف کی بنیاد پر ہے، نہ کہ جمہور کی اصطلاح کے مطابق۔ ان دونوں کتابوں میں ابن خواز کی تعریف ہی نقل کی گئی ہے۔ دیکھیے: جامع بیان العلم: ۹۹۲/۲، اعلام الموقعین: ۴۶۴/۳۔

اب مناسب ہے کہ ابن خواز کے حالات بھی معلوم کیے جائیں؛ تاکہ جمہور کے مقابل ابن خواز کی اصطلاح کا درجہ اور حیثیت معلوم ہو سکے۔ ابن فرحون کہتے ہیں: وله اختيارات كقوله فى أصول الفقه: ان العبيد لايدخلون فى خطاب الأحرار وان خبر الواحد يوجب العلم ... ولم يكن بالجيد النظر ولا قوى الفقه وقد قال فيه الباجى أبو الوليد: لم أسمع له فى علماء العراق ذكرا. (الدیباج المذہب: ۲۲۹/۲) ان کی کئی انفرادی آراء بھی ہیں۔ جیسے اصول فقہ میں کہتے ہیں: غلام آزاد کے خطاب میں داخل نہیں۔ اور خبر واحد قطعی ہے --- بحث کی اچھی صلاحیت نہیں رکھتے تھے اور فقہ میں بھی اچھی قابلیت نہیں تھی۔ ابوالولید باجی ان کے بارے میں کہتے ہیں: میں نے علمائے عراق میں ان کا ذکر نہیں سنا۔ لہٰذا ان کی بیان کی ہوئی تعریف کی حیثیت جمہور کے مقابل ایک شاذ قول کی ہے۔ (نیز دیکھیے: الاصلاح: ص۱۵۸، ۱۵۹، مولانا محمد گوندلوی م۱۴۰۵ھ)

مطلق تقلید سے تقلیدِ شخصی کے وجوب تک کی مختصر تاریخ

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں صحابہ کا طرزِ عمل یہ تھا کہ آپ ﷺ کے قول وفعل کا سنتے دیکھتے اتباع کرتے۔ جوضرورت ہوتی پوچھ لیتے۔ احکام کے اصول، اسباب اور علل نہ کسی نے دریافت کیے اور نہ پورے طور پر بیان کیے گئے۔ نہ تدوینِ فقہ کی حاجت تھی اور نہ جمعِ احادیث کی ضرورت۔ آپ ﷺ کی وفات کے بعد کچھ ایسے اسباب پیش آئے جن کی وجہ سے صحابہ میں بعض فروع میں اختلاف ہونے لگا۔ وہ اسباب یہ تھے کہ پہلے کے واقعے کے بارے میں کسی صحابی کو کوئی حدیث نہ پہنچی، یا پہنچی لیکن یاد نہ رہی، یا یاد رہی؛ مگر معنی سمجھنے میں غلطی ہوئی، یا کسی قرینے میں تاویل کی یا سند کو نا قابل اعتبار سمجھا اور دوسرے صحابی کا حال اس کے خلاف ہوا۔ اور نئے پیش آنے والے واقعے میں دونوں کا قیاس مختلف ہوا اور صاحب وحی سے پوچھنا ممکن نہ رہا۔ ان وجوہ سے بعض فروع میں اختلاف پیدا ہوا۔ پھر وہ صحابہ مختلف شہروں میں جا کر مقتدا ہوئے اور تابعین نے ہر شہر میں خاص خاص صحابی کا اتباع کیا اور طرزِ عمل ہر شہر کا قدرے جداگانہ طریق پر ہوگیا۔ صحابہ کے بعد تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں اسی طرح ہوتا رہا۔ (امداد الفتاوی: ۳۰۱/۵ بتسہیل وتوضیح)

ابن قیم (م ۷۵۱ھ) فرماتے ہیں: صحابۂ کرام میں سے جن حضرات سے فتاوی منقول ہیں ان کی تعداد ۱۳۰ سے کچھ زیادہ ہے۔ ان کی تین قسمیں ہیں: مکثر، متوسط اور مقل۔ ۷ مکثر، ۲۰ متوسط اور ۱۲۷ مقل ہیں (دیکھیے: اعلام الموقعین: ۱۷/۲ – ۲۲) اور فرماتے ہیں: دین، فقہ اور علم امت میں ابن مسعود، زید بن ثابت، عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس کے شاگردوں سے پھیلا۔ امت کا علم عام طور پر ان چار کے شاگردوں سے ہے۔ اہل مدینہ کا علم زید بن ثابت اور عبداللہ بن عمر کے شاگردوں سے، اہل مکہ کا علم عبداللہ بن عباس کے شاگردوں سے اور اہل عراق کا علم عبداللہ بن مسعود کے شاگردوں سے ہے۔ (اعلام الموقعین: ۳۸/۲) ابن ہمام (م ۸۶۱ھ) فرماتے ہیں: صحابہ میں مجتہدین فقہاء کی تعداد ۲۰ سے زائد نہیں۔ جیسے خلفاء (اربعہ)، عبادلہ، زید بن ثابت، معاذ بن جبل، انس، ابوہریرہ اور کچھ اور رضی اللہ عنہم۔ باقی ان سے رجوع کرتے اور ان سے فتوی معلوم کرتے۔ (فتح القدیر: ۴۷۰/۳)

عطا کہتے ہیں میں ہشام بن عبدالملک (اموی م ۱۲۵ھ) کے پاس گیا تو انھوں نے پوچھا عطا! تم شہروں کے فقہاء کو جانتے ہو؟ کہا: کیوں نہیں امیر المؤمنین! پھر ہشام نے ہر شہر کا الگ الگ نام

لے کر سوال کیا اور عطا نے جواب دیا کہ اہلِ مکہ کے فقیہ نافع، مدینہ کے عطا، یمن کے طاؤس، یمامہ کے یحییٰ بن ابی کثیر، شام کے مکحول، جزیرہ کے میمون بن مہران، خراسان کے ضحاک، بصرہ کے حسن و ابن سیرین، اور کوفہ کے ابراہیم نخعی ہیں۔ (مناقب موفق: ۱/۷، ۸ بتلخیص) صحابہ اور تابعین کے اہل فتوی سے دلیل پوچھنے اور بتانے کا التزام کہیں ثابت نہیں؛ بلکہ ان کی مہارت پر اعتماد کر کے عمل کیا جاتا تھا۔ اسی کو بعد میں جمہور اہلِ اصول کی اصطلاح میں تقلید کہا گیا، جیسے پہلے گزرا۔ (صحابہ وتابعین کے فقہاء کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: آثار التشریع: ۲/۲۵۴-۲۶۰)۔

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں: لأن الناس لم يزالوا من زمن الصحابة الى أن ظهرت المذاهب الأربعة يقلدون من اتفق من العلماء من غير نكير يعتبر انكاره ولو كان ذلك باطلا لأنكروه. (عقد الجید: ص۱۲) کیونکہ لوگ صحابہ کے زمانے سے لے کر مذاہب اربعہ کے ظاہر ہونے تک علماء میں سے جس کی تقلید کا اتفاق ہوتا کرتے رہے، بغیر کسی قابل اعتبار انکار کے۔ اگر یہ باطل ہوتا تو وہ ضرور اس کا انکار کرتے۔

امام ابوحنیفہ (م۱۵۰ھ) فرماتے ہیں: آخذ بكتاب الله، فما لم أجد فبسنة رسول الله والآثار الصحاح عنه التى فشت فى أيدى الثقات عن الثقات، فان لم أجد فبقول أصحابه آخذ بقول من شئت وأما اذا انتهى الأمر الى ابراهيم والشعبى والحسن وعطاء فأجتهد كمااجتهدوا. (مناقب الامام ابی حنیفۃ وصاحبیہ للذہبی: ص۳۴) میں کتاب اللہ سے لیتا ہوں، اگر نہ ملے تو رسول اللہ ﷺ کی سنت اور آپ کی ان صحیح حدیثوں سے کہ جو ثقات کے ہاتھوں ثقات ہی کے ذریعے شائع ہوئی ہیں۔ پھر اگر یہاں بھی نہ ملے تو آپ ﷺ کے اصحاب میں سے جس کا قول چاہتا ہوں اختیار کر لیتا ہوں؛ لیکن جب معاملہ ابراہیم نخعی، شعبی، حسن بصری اور عطاء بن ابی رباح تک آجاتا ہے تو جس طرح انھوں نے اجتہاد کیا میں بھی اجتہاد کرتا ہوں۔ (نیز دیکھیے: الانتقاء: ص۲۶۴ - ۲۶۷)۔ اس سے امام ابوحنیفہ کا طریقِ اجتہاد واضح ہوا۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: تاریخ تدوینِ حدیث: مولانا محمد عبدالرشید نعمانی (م۱۴۲۰ھ)

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں: اعلم أن الناس كانوا قبل المائة الرابعة غير مجمعين على التقليد الخالص لمذهب واحد بعينه. (حجۃ اللہ البالغۃ: ص۳۲۱) جان لو کہ لوگ چوتھی صدی سے پہلے ایک معین مذہب کی تقلیدِ خالص پر اکٹھے نہ تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ چوتھی صدی ہجری سے پہلے تقلیدِ مطلق اور تقلیدِ شخصی دونوں پر عمل تھا۔ اس وقت چونکہ طبیعتوں پر دینداری اور احتیاط غالب تھی؛

اس لیے دوسرے مذہب کے اہل فتوی سے بھی معلوم کرکے عمل کرنے میں خرابی نہ تھی۔ پھر طبائع کا رنگ بدلا اور مختلف مذاہب کے اقوال لینے میں خواہش پرستی کا اندیشہ ہوا تو مذہب معین کی پیروی کو ترجیح دی گئی۔(دیکھیے: تالیفاتِ رشیدیہ: ص۵۲۶، ۵۲۷) چنانچہ ابو اسحاق شاطبی (م۷۹۰ھ) فرماتے ہیں: ومتی خیرنا المقلدین فی مذاهب الأئمة لینتقوا منها أطیبها عندهم لم یبق لهم مرجع الا اتباع الشهوات فی الاختیار وهذا مناقض لمقصد وضع الشریعة فلایصح القول بالتخییر علی حال. (الموافقات:۵/۸۷)اور جب ہم نے مقلدین کواختیار دیدیا کہ ائمہ کے مذاہب میں سے جو انھیں اچھا لگے لے لیں تو ان کا مرجع خواہشات کی پیروی ہی رہ گیا (بوجہ دینداری غالب نہ ہونے کے)۔اور یہ بات شریعت مقرر کرنے کے ہی خلاف ہے(کیونکہ شریعت کا منشا خواہشات کوتابع کرنا ہے،ان کے تابع ہونا نہیں)۔لہٰذا مختلف مجتہدین کے اقوال لینے کا اختیار دینے کا قول بہرحال درست نہیں (بوجہ اس خرابی کے؛ بلکہ مجتہد معین کی تقلید لازم ہے)۔اور تقلید شخصی کو جو واجب کہا جاتا ہے یہ وجوب لغیرہ ہے۔

جس کے معنی یہ ہیں کہ اسے چھوڑنے میں ان امور میں خلل آتا ہے:اخلاص،خواہش پرستی سے بچنا،اجماع کی مخالفت نہ کرنا،احکام شریعت کے دائرے سے نہ نکلنا وغیرہ۔(دیکھیے:الاقتصاد:مقصد پنجم)تقلید شخصی کومقصود بالذات سمجھنا بے شک بدعت ہے؛لیکن مقصود بالغیر سمجھنا یعنی مقصود بالذات کا مقدمہ سمجھنا بدعت نہیں؛ بلکہ طاعت ہے۔(امداد الفتاوی:۵۶۹/۴، مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: تالیفاتِ رشیدیہ:ص۵۲۸،۵۲۹)۔

حافظ ابن صلاح شافعی (م۶۴۳ھ) کہتے ہیں: منذ دهر طویل طوی بساط المفتی المستقل المطلق والمجتهد المطلق وأفضی أمر الفتوی الی الفقهاء المنتسبین الی أئمة المذاهب المتبوعة.... وقد ذکر بعض الأصولیین منا أنه لم یوجد بعد عصر الشافعی مجتهد مستقل. (ادب المفتی والمستفتی:۲۹/۱،۳۱) طویل زمانہ ہوا کہ مفتی مستقل مطلق اور مجتہد مطلق کا خاتمہ ہو چکا۔اور فتوی کا کام مذاہب متبوعہ کے ائمہ کی طرف انتساب رکھنے والے فقہاء کے ہاتھ آ چکا۔۔۔۔ہمارے بعض اصولیین نے کہا ہے کہ امام شافعی کے زمانے کے بعد مجتہد مستقل نہیں پایا گیا۔ یاد رہے کہ یہ وہی ابن صلاح ہیں جن کی اصولِ حدیث پر معروف کتاب مقدمہ ابن صلاح اس وقت اصولِ حدیث کی معروف کتب کی اساس ہے اوران کے ذکر کردہ اصولوں سے ہمیں الزام دیا جاتا ہے!اور مخالفین سے عمل بالحدیث ان کے اصولوں کی تقلید کے بغیر نہیں ہو پاتا! قال

الشعرانی: کان(السیوطی) یقول: قد أشاع الناس عنی أنی ادعیت الاجتهاد المطلق کأحد الأئمة الأربعة وذلك باطل عنی، انما مرادی بذلك المجتهد المنتسب؛ فان الاجتهاد علی نوعین: أحدهما المطلق المستقل وهذا النوع قد فقد منذ القرن الرابع الهجری ولایتصور وجوده الآن. (الطبقات الصغری:ص۷) شعرانی کہتے ہیں:سیوطی فرماتے تھے: لوگوں نے میرے بارے میں مشہور کر رکھا ہے کہ میں ائمہ اربعہ کی طرح اجتہادِ مطلق کا دعوی کرتا ہوں۔ یہ بات میرے بارے میں بے اصل ہے۔ میری مراد مجتہد منتسب ہونا ہے؛ کیونکہ اجتہاد کی دو قسمیں ہیں: ایک مطلق مستقل اور یہ قسم چوتھی صدی سے ناپید ہے۔ اور اب نہیں پائی جاسکتی۔

ابن خلدون(م۸۰۸ھ) فرماتے ہیں: ومدعی الاجتهاد لهذا العهد مردود علی عقبه مهجور تقلیده وقد صار أهل الاسلام الیوم علی تقلید هؤلاء الأئمة الأربعة. (تاریخ ابن خلدون:۵۶۶/۱)اس زمانے میں اجتہاد کا دعوی کرنے والا مردود ہے اور اس کی تقلید متروک ہے۔ اس وقت اہل اسلام ان چار ائمہ کی تقلید پر قائم ہیں۔

شاہ ولی اللہ دہلوی(م۱۱۷۶ھ) فرماتے ہیں: ولما اندرست المذاهب الحقة إلا هذه الأربعة کان اتباعها اتباعا للسواد الأعظم والخروج عنها خروجا عن السواد الأعظم. (عقد الجید :ص۱۳) جب ان چار مذاہب کے علاوہ دیگر مذاہب حقہ ختم ہوگئے تو ان چاروں کا اتباع سوادِ اعظم (نجات پانے والی جماعت) کا اتباع ہے اور ان چاروں سے نکلنا سوادِ اعظم سے نکلنا ہے۔ (نیز دیکھیے :الفرقان : شاہ ولی اللہ نمبر،مولانا خیر محمد جالندھری اور مولانا محمد یوسف بنوری کا مضمون)

شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی(م۱۲۰۶ھ) کے بیٹے عبداللہ کہتے ہیں: نحن أیضا فی الفروع علی مذهب الاما م أحمد بن حنبل ولا ننکر علی من قلد أحد الأئمة الأربعة دون غیر هم لعدم ضبط مذاهب الغیر. (الدرر السنیۃ فی الاجوبۃ النجدیۃ :۲۲۷/۱) ہم بھی فروع میں امام احمد بن حنبل کے مذہب پر ہیں اور ائمہ اربعہ میں سے کسی کی تقلید کرنے والے پر ہم انکار نہیں کرتے ، نہ کہ دوسروں کی؛ کیونکہ ان کے مذاہب محفوظ نہیں۔

ہندوستان میں ترکِ تقلید کی تاریخ

ہندوستان میں تیرہویں صدی ہجری کے تقریباً وسط میں،عمل بالحدیث کے عنوان سے،ترکِ

تقلید کی تحریک کا آغاز ہوا۔اس جماعت کے ابتدائی رہنماؤں میں مولانا عبدالحق بنارسی (۱۲۰۶ - ۱۲۷۶ھ)،مولانا سید نذیرحسین دہلوی (۱۲۲۰ - ۱۳۲۰ھ) مولانا نذیرحسین غیرمقلدین کے ہاں شیخ الکل فی الکل ہیں۔مولانا نواب صدیق حسن خان قنوجی (۱۲۴۸ - ۱۳۰۷ھ)،مولانا محمد حسین بٹالوی (۱۲۵۶ - ۱۳۳۸ھ)،مولانا محمد وحیدالزماں حیدرآبادی (۱۲۶۷ - ۱۳۳۸ھ)،مولانا ثناء اللہ امرتسری (۱۲۸۷-۱۳۶۷ھ) وغیرہ شامل ہیں۔

(دیکھیے:ترجمانِ وہابیہ:ص ۱۵، ۱۶ مولانا صدیق حسن خان قنوجی (م۱۳۰۷ھ)،مطبع مفید عام،آگرہ ط:۱۳۰۰ھ،الارشاد الی سبیل الرشاد:ص۱۳،مولانا محمد شاہجہانپوری (م۱۳۳۸ھ)،مکتبہ ثنائیہ، لاہور ط:۲۰۰۶ء ،تنبیہ الضالین بر حاشیہ نظام الاسلام:ص۳ (درمجموعہ پانچ رسائل)،مطبع نامور پریس،الہ آباد ط:۱۳۰۷ھ)۔

مولانا محمد حسین بٹالوی تک مطلق تقلید کا انکار نہ تھا؛ بلکہ صرف تقلید شخصی کی مخالفت تھی۔مولانا ثناء اللہ امرتسری کے عہد سے مطلق تقلید کا انکار شروع ہوا۔اور غیر مقلدین آپس میں بھی محاذ آرار ہوئے۔ (دیکھیے: آثار الحدیث:۲/۳۹۰ - ۳۹۳)لفظ محدث اور اہلِ حدیث کی تشریح کے لیے دیکھیے:رسائلِ اعظمی:۱/۲۲۱-۲۶۸ تحقیق اہلِ حدیث،مولانا ابوالمآثر حبیب الرحمٰن اعظمی (م۱۴۱۲ھ)، تجلیاتِ صفدر:۵/۳۷۸ - ۴۰۷ لفظ اہلِ حدیث کے بارہ میں ضروری وضاحت کی درخواست،مولانا محمد امین صفدراوکاڑوی (م۱۴۲۱ھ) طائفہ منصورہ:مولانا محمد سرفراز خان صفدر (م۱۴۳۰ھ)۔

مولانا قطب الدین دہلوی اور مولانا نذیرحسین دہلوی میں تحریری مناظرے ہوتے تھے۔مولانا محمد قاسم نانوتوی (م۱۲۹۷ھ) فرماتے ہیں ایک مرتبہ میری زبان سے نکل گیا کہ اگر کسی قدر نواب صاحب ڈھیلے پڑجائیں اور کسی قدر مولوی نذیرحسین اپنا تشدد چھوڑ دیں تو جھگڑا مٹ جائے۔میری اس بات کو کسی نے نواب قطب الدین خان صاحب تک بھی پہنچا دیا اور مولوی نذیرحسین صاحب تک بھی۔مولوی نذیرحسین صاحب تو سن کر ناراض ہوئے؛مگر نواب صاحب پر یہ اثر ہوا کہ جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا وہاں تشریف لے آئے اور آکر میرے پاؤں پر عمامہ ڈال دیا اور پاؤں پکڑ لیے اور رونے لگے۔اور فرمایا بھائی جس قدر میری زیادتی ہو خدا کے واسطے تم مجھے بتلا دو، میں سخت نادم ہوں۔ اور مجھ سے بجز اس کے کچھ بن نہ پڑا کہ میں جھوٹ بولوں۔لہٰذا میں نے جھوٹ بولا اور صریح جھوٹ میں نے اسی روز بولا تھا۔اور کہا کہ حضرت آپ میرے بزرگ ہیں میری کیا مجال تھی کہ میں ایسی گستاخی کرتا۔آپ سے کسی نے غلط کہا ہے۔غرض میں نے بمشکل تمام ان کے خیال کو بدلا اور بہت

دیر تک وہ بھی روتے رہے اور میں بھی روتا رہا۔ جب مولانا نے یہ قصہ بیان فرمایا اس وقت بھی آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

اس حکایت پر حضرت تھانوی کا حاشیہ ملاحظہ ہو۔قولہ: پاؤں پر- مجھے بتلادو: اقول: کیا انتہا ہے اس للّٰہیت کی۔ ایسے بزرگ پر کب گمان ہوسکتا ہے کہ نفسانیت سے مناظرہ کرتے ہوں گے! قولہ: جھوٹ بولا۔ اقول: چونکہ اس میں کسی کا ضرر نہ تھا، اس لیے اباحت کا حکم کیا جائے گا۔ (ارواحِ ثلاثہ: ص۳۱۴، ۳۱۵ بتلخیص) صاحبِ نزہۃ الخواطر نے مولانا قطب الدین دہلوی کے بارے میں یہ تبصرہ کیا ہے: شديد التعصب على من خالفه في المذهب. (نزہۃ الخواطر: ۱۰۶۹/۷) جو فقہی مذہب میں ان کی مخالفت کرتا اس کے خلاف شدید تعصب رکھتے تھے۔ مذکورہ بالا حکایت سے معلوم ہوا کہ یہ تبصرہ قابلِ اصلاح ہے۔ جس کے اخلاص اور خشیت کا یہ حال ہو اس میں تعصب (بے جا حمایت ومخالفت) کا فیصلہ درست نہیں۔ دراصل مخالفین نے جو اودھم مچا رکھا تھا اس کے جواب اور اصلاح میں مولانا قطب الدین کا کلام تھا۔ یہ فرق ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ابتدا، کس نے کی اور جواب کون دے رہا ہے؟ (نیز دیکھیے: تجلیاتِ صفدر: ۳۴۴/۵-۳۵۹)۔

اس جماعت کی ابتدائی کتابوں میں ترجمانِ وہابیہ: مولانا صدیق حسن خان۔ مآثرِ صدیقی: مولانا صدیق حسن خان کی سوانح حیات جو ان کے بیٹے نے لکھی۔ عرف الجادی من جنان ہدی الہادی: مولانا علی حسن خان بن مولانا صدیق حسن خان۔ الاقتصاد فی مسائل الجہاد: مولانا محمد حسین بٹالوی۔ نزل الابرار من فقہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم المختار، کنز الحقائق من فقہ خیر الخلائق صلی اللہ علیہ وسلم، ہدیۃ المہدی من فقہ المحمدی صلی اللہ علیہ وسلم: مولانا محمد وحید الزماں حیدرآبادی۔ صلاۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم: مولانا محمد صادق سیالکوٹی (م.....ھ) یہ اس جماعت کی پہلی مکمل کتابِ نماز سمجھی جاتی ہے؛ لیکن اس میں احادیث کے حوالہ جات کی غلطیاں اور مخرجین کا احادیث کی تصحیح وتضعیف میں اختلاف بڑا دلچسپ ہے۔ (دیکھیے: چھپے راز: مفتی محمد عمر)۔

اجتہاد وتقلید پر لکھی گئی کتابیں

مولانا عبدالحی حسنی (م۱۳۴۱ھ) نے اپنی کتاب الثقافة الاسلامية فی الهند میں اجتہاد وتقلید کے موضوع پر جانبین کی کتب کی ایک فہرست دی ہے۔ (ص۱۱۸، ۱۱۹)۔ ہم یہاں اس موضوع پر کچھ اہم کتب ورسائل کا مختصر تذکرہ کرتے ہیں۔ ۱: عقد الجيد فی أحكام الاجتهاد والتقليد:

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (م۱۱۷۶ھ) ۲: ذب ذبابات الدراسات عن المذاهب الأربعة المتناسبات: ملاعبداللطیف سندھی (م۱۱۸۹ھ) اس پر مولانا محمد عبدالرشید نعمانی (م۱۴۲۰ھ) کی تعلیقات بھی ہیں۔ ۳: فتح الاسلام: مولانا محبوب العلی () ۴: نظام الاسلام: مولانا محمد وجیہ کلکتوی () ۵: تنبیہ الضالین وہدایۃ الصالحین: علمائے کلکتہ، ۶-۸: تنویر الحق، توفیر الحق، تحفۃ العرب والعجم: مولانا نواب محمد قطب الدین خان دہلوی (م۱۲۸۹ھ) ۹: مدار الحق فی رد معیار الحق: مولانا محمد شاہ پنجابی دہلوی (م۱۳۰۵ھ) ۱۰: انتصار الحق فی اکساد اباطیل معیار الحق: مولانا ارشاد حسین رامپوری (م۱۳۱۱ھ) ۱۱: کشف الحجاب: مولانا قاری عبدالرحمٰن پانی پتی (م۱۳۱۴ھ) ۱۲: اوثق الجید فی بیان التقلید: مولانا محمد ظہیر احسن نیموی (م۱۳۲۲ھ) ۱۳: سبیل الرشاد (ایک حصہ): مولانا رشید احمد گنگوہی (م۱۳۲۳ھ) ۱۴: القول السدید فی اثبات التقلید: مولانا فتح محمد لکھنوی (م۱۳۲۷ھ) ۱۵: الفتح المبین فی کشف مکائد غیر المقلدین: مولانا منصور علی مرادآبادی (م۱۳۳۷ھ) ۱۶: ایضاح الادلۃ (بحث خامس): مولانا محمود حسن دیوبندی (م۱۳۳۹ھ) ۱۷: الاقتصاد فی التقلید والاجتہاد: مولانا اشرف علی تھانوی (م۱۳۶۲ھ) اس میں احادیث سے اجتہاد وتقلید کا مبحث ثابت کیا ہے۔ بندہ کی تعلیق وتخریج کے ساتھ المصباح، لاہور سے مطبوع ہے۔ اور یہ موضوع پڑھنے پڑھانے کے لیے بہترین درسی متن ہے۔ ۱۸: تنقیح التنقید: مولانا سید مرتضیٰ حسن چاندپوری (م۱۳۷۱ھ) ۱۹: اللامذهبية قنطرة اللادينية: شیخ محمد زاہد کوثری (م۱۳۷۱ھ) ۲۰، ۲۱: خیر الارشاد الی التقلید والاجتہاد، خیر التنقید فی سیر التقلید: مولانا خیر محمد جالندھری (م۱۳۹۰ھ) ۲۲: الدین القیم: مولانا ظفر احمد عثمانی (م۱۳۹۴ھ) ۲۳: اجتہاد اور تقلید کی بے مثال تحقیق: مولانا محمد ادریس کاندھلوی (م۱۳۹۴ھ) ۲۴: مسئلہ تقلیدِ شخصی: مفتی محمد شفیع (م۱۳۹۶ھ) ۲۵: اجتہاد وتقلید: مولانا قاری محمد طیب (م۱۴۰۳ھ) ۲۶: اختلافِ امت اور صراطِ مستقیم (حصہ دوم): مولانا محمد یوسف لدھیانوی (م۱۴۲۱ھ) ۲۷: تجلیاتِ صفدر (متفرق مضامین): مولانا محمد امین صفدر اوکاڑوی (م۱۴۲۱ھ) ۲۸، ۲۹: طائفہ منصورہ، الکلام المفید فی اثبات التقلید: مولانا محمد سرفراز خان صفدر (م۱۴۳۰ھ) ۳۰-۳۲: وقفة مع اللامذهبية فی شبه القارة الهندية، وقفة مع معارضی شیخ الاسلام محمد بن عبدا لوهاب، صو ر تنطق: مولانا محمد ابوبکر غازی پوری (م۱۴۳۳ھ) ۳۳: اللامذهبية أخطربدعة تهدد الشريعة الاسلامية: دکتور محمد سعید رمضان بوطی (م۱۴۳۴ھ) ۳۴: تقلید کی شرعی حیثیت: مفتی محمد تقی عثمانی۔ اس کتاب کا انگریزی میں ترجمہ ہوچکا ہے۔ ۳۵، ۳۶: التقليد المذهبی مايجوز منه

ومالايجوز، أثر الحديث الشريف فى اختلاف الأئمة الفقهاء: شیخ محمد عوامہ ۳۷:التمذهب: عبدالفتاح یافعی ۳۸: قرارات مجمع الفقه الاسلامى بمكة المكرمة: القرار التاسع من الدورة العاشرة: ص۲۳۳ - ۲۳۷، اسلامی فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ کے فقہی فیصلے: ص۲۹۰ - ۲۹۴ ،مترجم مفتی فہیم اختر ندوی۔ ۳۹: امت میں افتراق واختلاف: مولانا محمد عبدالمالک نیز دیکھیے: علمائے اہل سنت کی تصنیفی خدمات کی ایک جھلک: ص۵۸-۶۰، پیر جی سید مشتاق علی شاہ۔

دعوی اجتہاد کا امتحان

اس زمانے میں اگر کسی کو اجتہاد کا دعوی ہو تو اس کا امتحان بہت آسان ہے۔ فقہ کی کسی کتاب سے جس میں قرآن وحدیث کے دلائل مذکور نہ ہوں مختلف ابواب کے سو سوالات جو منصوص نہ ہوں وہ لے لیے جائیں۔ اور مجتہد صاحب ان کے جوابات قرآن وحدیث سے مستنبط کریں اور جن اصول پر استنباط کریں انھیں بھی قرآن وحدیث یا دلیل عقلی شافی سے ثابت کریں اور پھر انصاف کے ساتھ فقہاء کے جوابات اور دلائل سے موازنہ کریں۔ اس وقت اپنے فہم کا مبلغ اور ان کی قدر معلوم ہو جائے گی اور آئندہ اجتہاد کا دعوی زبان پر نہ آئے گا؛ چنانچہ اہل بصیرت کو معلوم ہو گیا ہے کہ چار صدی بعد یہ قوت (اجتہادِ مطلق کی) ختم ہو گئی۔ (الاقتصاد: ص۵۲ بتلخیص) چنانچہ تجلیاتِ صفدر: ۴۱۲/۵ - ۵۲۷ میں ایسے سیکڑوں سوالات مذکور ہیں۔

* * *

نئی کتاب

نام کتاب : گناہوں سے بچیے
مصنف : مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی
صفحات : ۱۶۸
ناشر : مکتبہ ایلاف، دیوبند،فون نمبر:6398993606
تعارف نگار : ڈاکٹر مفتی اشتیاق احمد قاسمی استاذ دارالعلوم دیوبند

====================

اللہ تعالیٰ نے انسانوں اور جنوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ بندوں کے لیے بندگی لازم ہے۔ اگر بندہ بندگی سے سرتابی کرتا ہے تو وہ گنہگار کہلاتا ہے۔ بڑی سرتابی بڑا گناہ ہے اور چھوٹی سرتابی چھوٹا گناہ ہے۔ ہر گناہ سے بچنا ضروری ہے، چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی منع کی ہوئی چیزوں کا ارتکاب گناہ ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے احکامات کو چھوڑنا بھی گناہ ہے۔ شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے، وہ اللہ کی نافرمانی پر اکساتا رہتا ہے۔ اسی طرح انسان کا نفس بھی اس کا دشمن ہے، جو اپنی خواہشات پر انسان کو چلانے کی کوشش کرتا ہے؛ لیکن یہ دونوں دشمن اتنے بااختیار نہیں ہیں کہ کسی کا ہاتھ پکڑ کر گناہ کروادیں، بلکہ یہ ذہن میں بات ڈالنے، اکسانے اور ترغیب دینے تک محدود ہیں۔ انسان جب اپنی مرضی سے کسی برے کام کا ارتکاب کرتا ہے تو اپنے عمل کی وجہ سے مجرم ٹھہرتا ہے۔

میرے سامنے مولانا مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی، نائب ناظم امارتِ شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ کی تصنیف ''گناہوں سے بچیے'' موجود ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے مختلف گناہوں کا تذکرہ کرکے ان سے بچنے کی تدابیر نہایت سادہ اور مؤثر انداز میں بیان فرمائی ہیں۔ شرک، نفاق، ریاکاری، بدگمانی، بدنگاہی، بدمزاجی، تعصب، دھوکہ دہی، چغل خوری، چوری، قطع رحمی، تہمت، غیبت، ظلم، امانت میں خیانت، حرام خوری، جنسی بے راہ روی، شراب نوشی، جادو، سود، جوا اور سٹّا جیسے گناہوں

کے ساتھ ساتھ عصرِ حاضر کی بعض نئی برائیوں، مثلاً ٹرولنگ، جھوٹی خبروں کی اشاعت، اشتعال انگیز پیغامات اور فحش مواد کے پھیلاؤ پر بھی تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ اسی طرح اپریل فول کے نام پر جھوٹ بولنے اور یومِ عاشقی جیسی غیر اسلامی رسوم کے نقصانات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

کتاب کے آغاز میں ایک مقدمہ شامل ہے، جس میں مصنف نے گناہوں کے بنیادی اسباب اور ان کے مضر اثرات کا ذکر کیا ہے۔ ان کے نزدیک دین سے دوری، جہالت و نادانی، مال و دولت کی بے جا حرص، بری صحبت اور بے لگام جنسی خواہشات گناہوں کے اہم اسباب ہیں۔ نیز گناہوں کے نقصانات بیان کرتے ہوئے انھوں نے واضح کیا ہے کہ گناہوں کی وجہ سے انسان علم کی برکت سے محروم ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور سزا کا مستحق بنتا ہے، اور اس کی جسمانی و روحانی صحت بھی متاثر ہوتی ہے۔

مصنف کے نزدیک گناہوں سے بچنے کا سب سے مؤثر ذریعہ خوفِ خدا ہے۔ جب بندے کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا ہو جاتا ہے تو وہ توبہ و استغفار کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔

مصنفِ محترم کو دارالعلوم دیوبند میں حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری رحمہ اللہ سے خصوصی تربیت حاصل رہی۔ دین کی تبلیغ کے عنوان پر انھوں نے حضرت کی نگرانی میں ایک رسالہ تحریر کیا تھا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کے قلم میں ایسی روانی، برکت اور تاثیر عطا فرمائی کہ آج تک ان کی تصنیفی و علمی خدمات کا سلسلہ جاری ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب بھی اصلاحِ نفس اور اصلاحِ معاشرہ کے متعدد پہلوؤں پر مشتمل ایک مفید تصنیف ہے۔ جو شخص اس کا مطالعہ کرے گا، وہ گناہوں سے بچنے کی بہت سی عملی تدابیر حاصل کرے گا اور اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت کا جذبہ پروان چڑھے گا۔ ساتھ ہی شیطان اور نفسِ امارہ کے بہکاووں سے محفوظ رہنے کی ترغیب بھی ملے گی۔

کتاب عمدہ کاغذ، معیاری طباعت اور اچھی کتابت سے مزین ہے۔ امید ہے کہ قارئین اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور اس سے بھرپور استفادہ کریں گے۔

❊ ❊ ❊